# فلسفۂ شہادت

بعنوان شہادت پانچ منتخب تقاریر

سید العلماء آیت اللہ العظمیٰ

حضرت علامہ سید علی نقی نقویؒ (نقن صاحب) اعلی اللہ مقامہٗ

# فلسفۂ شہادت

## پانچ تقاریر

سید العلماء آیت اللہ العظمیٰ
حضرت علامہ سید علی نقی نقوی اعلی اللہ مقامہ

بین الاقوامی ادارہ ترویج سوزخوانی

# شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

۱۸؍ مارچ ۲۰۱۳ء پاکستان کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش یوم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جب سرمایۂ ملت، یگانہ روزگار سوزخواں/ذاکر اور ان گنت خصوصیات کے حامل پروفیسر سبط جعفر زیدی شہید کردیے گئے۔ پروفیسر سید سبط جعفر صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر سید العلماء حضرت علی نقی (نقن) صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کی شہادت کے عنوان پر بصیرت افروز تقاریر شائع کی جارہی ہیں۔ پروفیسر صاحب مشتاقِ شہادت تھے اور اپنی آرزو اور خواہش کا اظہار نثر اور نظم میں بارہا کر چکے تھے، ان کی برسی کے حوالے سے سید العلماء کی ان تقاریر کا مطالعہ نہ صرف فلسفۂ شہادت کی اہمیت کو واضح کرے گا بلکہ پروفیسر صاحب شہید کے درجات کی بلندی کا سبب بھی قرار پائے گا۔

مزید برآں پروفیسر صاحب کی ذات و خدمات کے حوالے سے ایک یادگار کتاب تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور انشاء اللہ بہت جلد نذرِ قارئین کی جائے گی، اس سلسلے میں ہمیں مومنین کی آراء/تجاویز یا پروفیسر صاحب کی نادر تصاویر (اگر موجود ہوں) کا انتظار ہے تاکہ ہم یہ مہتمم بالشان کتاب پروفیسر صاحب کے ہزاروں مداحوں کی توقعات کو پورا کرسکے اور ان کی بیش بہا خدمات کا کچھ حق ادا ہو سکے۔ فی الحال برسی کے موقع پر استاد کے مداحوں کے لیے ایک منتخب شعری مجموعہ اور استاد کے کلام اور تقاریر سے منتخب ایک DVD بھی پیش کی جارہی ہے۔

ادارہ ترویج سوزخوانی/خانوادہ پروفیسر سید سبط جعفر شہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ اگلے صفحات میں آپ سید العلماء آیت اللہ العظمیٰ حضرت علامہ سید علی نقی نقویؒ کی وہ پانچ تقاریر تحریری صورت میں ملاحظہ فرمائیں گے جو حضرت نے ''فلسفۂ شہادت'' کے موضوع پر ارشاد فرمائی تھیں۔

پانچوں مجالس مسلسل ہیں اور ''شہادت'' کے موضوع پر احسن طریقے سے روشنی ڈالی گئی۔ مجلس کے ذوق کے مطابق سر راہ دیگر علمی، ادبی اور فضائلِ اہلِ بیتؑ سے متعلق نکات بھی موجود ہیں اور موضوع کے ساتھ بھرپور انصاف کیا گیا ہے۔

''شہادت'' کا موضوع ہر زمانے میں مومنین کے لیے اہم رہا ہے۔ کفار، مشرکین، بنوامیہ اور بنوعباس کے بعد موجودہ زمانے میں مومنین کی مختلف محاذوں اور ٹارگٹ کلنگ (Target Killing) میں شہادتوں کا سبب آلِ محمدؐ کی محبت اور ان کی مداحی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ جرم اہلِ بیتؑ کے دشمنوں کے نزدیک ناقابلِ معافی ہے تو دوسری طرف مومنین کے لیے یہی سرمایۂ نجات ہے۔

ادارۂ ترویجِ سوزخوانی کی جانب سے اس کتاب کی اشاعت شہید پروفیسر سید سبطِ جعفر زیدی اعلیٰ اللہ مقامہ کی پہلی برسی کے موقع پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کی جارہی ہے۔ شہیدؒ کے چاہنے والوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی طویل فہرست میں اس حقیر کا نام بھی شامل ہے۔ مربی اور معلم کو کیسا ہونا چاہیے اس کا عملی جواب شہیدؒ کی سیرت میں ان کے ہر شاگرد نے ملاحظہ کیا۔ امیدِ قوی ہے کہ ان کی شہادت کے بعد ان کے تمام شاگرد بھی اپنے استادؒ کی روش کو برقرار رکھیں گے اور ان کے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ پروفیسر سبطِ جعفر زیدی شہیدؒ کے تمام شاگرد خصوصاً اور عمومی طور پر تمام مومنین اس کتاب کو فلسفۂ شہادت کی تفہیم میں معاون پائیں گے۔ ان شاءاللہ

کوشش کی گئی ہے کہ جو آیات اور احادیث حضرت علامہؒ نے بیان کی ہیں ان کے حوالے بھی دے دیے جائیں تاکہ بہتر استفادہ ممکن ہو سکے۔ اس سلسلے میں معروف سوفٹ ویئر ''نور جامع احادیث'' سے استفادہ کیا گیا۔

آخری بات: ''معراج خطابت'' کے نام سے مولانا عابد عسکری صاحب اور ''مجموعۂ تقاریر'' مولانا سید افسر عباس زیدی صاحب نے سید العلماءؒ کی تقاریر کا مجموعہ مرتب کیا تھا ان سے متعلقہ تقاریر کا متن ممکنہ طور پر اردو کی غلطیاں دور کرنے اور حوالوں کے اضافے کے بعد انتخاب کیا گیا ہے۔ میں بھی اہلِ زبان نہیں ہوں ممکن ہے کہ اب بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں اہلِ نظر متوجہ کریں تاکہ آئندہ اشاعت مزید بہتر ہو سکے۔

مولانا عسکری، مولانا افسر عباس زیدی اور دیگر تمام اداروں اور دوستوں کا شکر گذار ہوں۔

شہید پروفیسر سبط جعفر زیدیؒ کے اشعار پر ہی ختم کرتا ہوں:

عشق جب تک نہ ہو شعر ہوتا نہیں
مجھ میں کب اہلیت تھی تیری مدح کی
میرے مولاؑ میں قرباں تیرے عشق کے
سبط جعفرؒ کو بھی شاعری آگئی

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

محمد رضا داؤدانی

۱۱ر جمادی الاول

۱۳ر مارچ ۲۰۱۴ء

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ فِيْ كِتَابِ الْمُبِيْنِ وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

# فلسفۂ شہادت

# پہلی تقریر

- زندگی اور موت کا قرآنی تصور
- ''مردہ مت کہو'' اور ''مردہ مت سمجھو'' معاملہ صرف تہذیب لفظی کا نہیں ہے۔
- زمین کے زندہ ہونے کا مطلب
- ''فنا'' تمہید بقا بن جائے تو شہادت حاصل ہوتی ہے۔
- زمین نباتات کے، نباتات حیوانات کے، حیوانات انسان کے کام آئے۔
  - ☆ ذبح حیوانات پر تنقید کا جواب
  - ☆ ''ذبیحہ'' اور ''میتۃ'' کا فرق۔
- شہادت کی بشارت پر حضرت علیؑ کا اظہار مسرت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًاط بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ (آل عمران 169/3)

ارشادالٰہی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی بارگاہ میں رزق پاتے ہیں۔

عام طور پر جسے سب زندگی سمجھتے ہیں، وہ اس جسم سے روح کے ظاہری تعلق کا قائم ہونا ہے اور موت اس تعلق کا قطع ہو جانا ہے اور چونکہ موت طبعاً ناپسند ہے اور زندگی پسندیدہ چیز ہے، اس لئے خطروں سے قدم پیچھے ہٹائے جاتے ہیں۔ جب جان جانے کا اندیشہ ہو تو خطرہ سے دامن بچانے کے لئے ہٹ جایا جاتا ہے۔ مگر اسلام نے زندگی اور موت کے مفہوم کو بدل دیا۔ اُس نے یہ بتایا کہ جسے تم موت سمجھتے ہو، ضروری نہیں ہے کہ وہ موت ہو۔ بہت ممکن ہے کہ جسے تم زندگی سمجھتے ہو، وہ موت ہو اور جسے تم موت سمجھتے ہو، حقیقت میں زندگی ہو۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں زندگی میں موت کے نقشے بھی نظر آتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہوئے انسان، ہنستے بولتے ہوئے انسان، سانس لیتے ہوئے انسان۔ مگر قرآن مجید انہیں زندہ تسلیم نہیں کرتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (فاطر 22/35)

"جو مردہ ہیں اور جو زندہ ہیں، دونوں برابر نہیں ہیں"۔

یہ زندہ اور مردہ وہ نہیں ہیں جو زندہ یہاں ہیں اور مردہ قبرستانوں میں ہیں بلکہ انہی افراد میں جو سامنے نظر آتے ہیں، کچھ زندہ ہیں اور کچھ مردہ ہیں۔

ایک آیت ہے، ارشاد ہو رہا ہے:

"يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ" (الانفال 24/8)

"اے صاحبانِ ایمان! لبیک کہو اللہ اور رسول کی آواز پر جب وہ دعوت دیں اس شے کے لئے جو تمہیں زندہ کر دے گی"

اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی مردہ ہیں۔ جب اس پیغام کو سنیں گے، سمجھیں گے تو زندہ ہو جائیں گے۔

"إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيْلًا" (الفرقان 44/25)

"مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ اس سے بدتر ہیں"۔ چوپائے تو پھر بھی ایک طرح کی زندگی رکھتے ہیں، جیسا کہ لفظ حیوان سے ظاہر ہے مگر سورہ منافقون میں زندہ انسانوں کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے:

"كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ" (المنافقون 4/63)

"یہ لکڑیاں ہیں جو ہوا میں لگا کر کھڑی کر دی گئی ہیں"۔

یہاں زندگی کا نام و نشان بھی نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ زندگی جو حیاتِ نباتی کہلاتی ہے، جو پودوں میں ہوتی ہے، وہ بھی نہیں ہے کیونکہ وہ زندگی شاخ میں اس وقت ہوتی ہے جب تک اصل سے متصل ہو۔ جب اصل سے

جدا ہوگئی اور خشک لکڑی کی صورت میں وہ کھڑی کردی گئی تو اس میں زندگی کا پتا بھی نہیں ہے۔ یہ تو زندگی میں موت ہے۔

شہدائے راہِ خدا، ان کی روح اور جسم میں تعلق کیسا؟ سر اور گردن میں بھی ارتباط نہ رہا مگر قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو۔ دوسرے پارے میں سورۂ بقرہ میں یہی الفاظ ہیں:

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ O (البقرۃ 154/2)

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، تمہیں شعور نہیں ہے۔"

یہاں جو الفاظ ہیں ان سے سطحی نظر رکھنے والا دھوکہ کھا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ مردہ نہ کہو تو اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ہیں تو مردہ مگر مردہ کہنا ادب کے خلاف ہے۔ یعنی جیسے تہذیبِ لفظی سکھائی جارہی ہے۔ بہت سے الفاظ کے معنی درست ہوتے ہیں لیکن محاورے کے لحاظ سے ان کا استعمال غلط ہوتا ہے۔ تمیز کے خلاف ہوتا ہے۔ جیسے کوئی چھوٹا بڑے کو یہ لکھ دے "سَلَّمَکَ اللّٰہُ" معنی کے لحاظ سے درست ہے۔ کیا بڑوں کو سلامتی کی ضرورت نہیں ہے؟ لیکن کسی بڑے کو لکھ کر دیکھئے، ناراض ہوجائے گا کہ یہ صاحبزادے مجھ کو "سَلَّمَکَ اللّٰہُ" لکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معنی کے لحاظ سے درست ہے لیکن محاورے کے لحاظ سے ان کی شانِ بزرگی کے خلاف ہے کہ ان کو "سَلَّمَکَ اللّٰہُ" لکھا جائے۔

کراچی میں ایک مجلس میں ایک صاحب مجھ سے بہت کم عمر تھے، انہوں نے مجھ سے کہا: "اللہ عمر دراز کرے" اب الفاظ چاہے درست ہوں، بڑا چھوٹے کے لئے کہے گا کہ عمر دراز ہو۔ چھوٹا بڑے کے لئے یہ نہیں کہے گا۔ اسی طرح خیال آتا ہے کہ شاید یہی قرآن مجید نے سکھایا ہو ہم کو کہ شہدائے راہِ خدا کو مردہ نہ کہو۔ حالانکہ اسی میں آخر میں ایک لفظ ہے جو اس غلط فہمی کو دور کرتا ہے کہ زندہ ہیں، تمہیں شعور نہیں ہے۔ تو شعور کا تعلق کسی حقیقت سے ہوتا ہے، لفظی تہذیب سے نہیں ہوتا۔ مگر جس آیت کو میں نے سرنامہ کلام قرار دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا جا رہا کہ انہیں مردہ نہ کہو بلکہ یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جو راہِ خدا میں قتل ہو گئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو۔

یہ سمجھنا اور نہ سمجھنا الفاظ سے متعلق نہیں ہے۔ کتابِ حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر حقیقت کو حقیقت سمجھنے کی دعوت دے۔ جب اس نے مردہ سمجھنے سے منع کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت میں وہ مردہ نہیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ زندگی کیا ہے اور یہ موت کیا چیز ہے؟ یہ زندگی اور موت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تمام اشیائے کائنات میں یہ زندگی اور موت کارفرما ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جمادات ہیں، اس کے بعد نباتات ہیں، اس کے بعد حیوانات ہیں، اس کے بعد انسان ہے۔ زمین تو جمادات میں داخل ہے۔ مگر قرآن مجید میں دیکھئے تو زمین کی بھی دو حالتیں ہیں، ایک وہ حالت جب وہ مردہ ہے اور دوسری وہ حالت جبکہ وہ زندہ ہو گئی۔ ایک آیت میں نہیں، بہت سی آیتوں میں ایک ساتھ یہ الفاظ ہیں:

"يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (الروم 19/30)

''اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے''

تو ایک وقت میں وہ عالم موت میں ہوتی ہے اور دوسرے وقت میں اللہ اس کو زندہ کرتا ہے تو اس کو حیات مل جاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ، وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔

"بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ؕ (الاعراف:57/7)

''اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری دیتا ہوا وہ ہواؤں کو چلاتا ہے''۔

ہوائیں بادلوں کو لاتی ہیں۔ ان بادلوں کو ہم لے جاتے ہیں ایک زمین مردہ کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں تو وہ زمین نباتات کو روئیدہ کرتی ہے ۔ دیکھو! یوں ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں۔

تو زمین ایک وقت میں مردہ۔ تو زمین میں مُردہ کون؟ وہ بنجر زمین جس میں نباتات کے روئیدہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جس میں زراعت نہ ہو سکے۔ وہ زمین مُردہ اور زمین زندہ کون؟ جس میں نشو ونما پیدا ہو جائے۔ قوت نامیہ کارفرما ہو جائے۔ سادہ زبان میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ذرا دیکھئے یہ نشو ونما کیا چیز ہے؟ یہ دانے اور بیج آپ کے ہاتھ میں رہتے تو جتنے تھے اُتنے ہی رہتے۔ ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی صندوق میں رکھ دیتے، صندوق کو مقفل کر دیتے، صندوق کو کمرے میں رکھ دیتے۔ بہت سے قفل کمرے پر ڈال دیتے، پہرے لگا دیتے، یہ سب حفاظت کا سامان کرتے مگر جتنے تھے، اُتنے ہی رہتے۔ مگر یہی دانے اور بیج، زمین کی تھوڑی سی مٹی نکال کر اگر زمین کی تہوں میں ان کو چھپا دیا جائے اور پانی سے تر کر دیا جائے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جسے دنیا کے ہاتھ دباتے ہیں اُسے اللہ اُبھارتا ہے۔ جسے دنیا خاک میں ملاتی

ہے، اُسے اللہ پروان چڑھاتا ہے۔ تھوڑے ہی دن میں وہ بیج کونپلوں کی شکل میں زمین سے برآمد ہوتا ہے۔

غور فرمایئے ، یہ نرم ملائم کونپلیں اور زمین کا سخت جگر۔ ایسی ملائم کونپل جو قطرۂ شبنم کا بار برداشت نہ کر سکے، جو ہوا کی ذراسی جنبش سے متاثر ہو جائے ۔ اتنی سخت زمین میں اس نے شگاف ڈال دیا۔ تو یہ زبانِ بے زبانی میں جواب دے گی۔ اگر میرے سامعہ فہم میں طاقت ہو تو میں سنوں کہ وہ یہ کہے گی کہ یہ میری ذاتی طاقت نہیں ہے۔ یہ کسی اور طرف کی طاقت ہے۔ جس سے میں نے یہ شگاف ڈال دیا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک کونپل میں اللہ کی طاقت کارفرما ہو جائے تو وہ پتھر میں شگاف ڈال دے تو اگر کسی کامل و اکمل و مکمل انسان کی انگلیوں میں اس کی طاقت کارفرما ہو جائے اور وہ لوہے کے در میں در آئیں تو حیرت کی کیا بات ہے؟

غرض وہ دانے اور بیج تھوڑے عرصہ میں اتنے بڑھے کہ ممکن ہے کہ ایسا سایہ دار درخت ہو جائے کہ قافلے اس کے سائے میں پناہ لیں۔ ممکن ہے ایسی وافر زراعت ہو جائے جو پورے خاندان کی پرورش کر سکے۔ تو سب سے پہلے قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ اجزاء کہاں سے آئے؟ کہاں یہ اتنی پھیلی ہوئی زراعت اور کہاں وہ بیج! دوسری بات یہ کہ جب ہم نے وہ دانے اور بیج زمین میں ڈالے تھے تو زمین خاک کے ذروں سے پٹی ہوئی تھی۔ اس دانے اور بیج کی خاطر کچھ مٹی ہمیں نکالنا پڑی، تب اس کی جگہ ہوئی۔ تو بعد میں اس کو گنجائش کیونکر ملی؟ یہ جگہ کیونکر ملی کہ اندر ہی اندر اتنے پاؤں پھیلا لئے۔ جب ہم اس

پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام اجزاء الگ سے نہیں آئے ہیں۔ زمین ہی میں قدرت نے کچھ ایسے اجزاء ودیعت کئے ہیں جو اپنے سے مافوق یعنی نباتات کے کام آنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زمین امانت داری کے ساتھ خدا کے ودیعت کئے ہوئے ان ذرّات کو محفوظ رکھتی ہے، ایک حقدار کے آنے کے انتظار میں۔ جب وہ حقدار آجاتا ہے تو زمین اللہ کی ودیعت کی ہوئی اس امانت کو، ان اجزاء کو پیش کردیتی ہے اپنے سے بالاتر مخلوق کے لئے۔ بنیادی اجزاء وہی ہیں۔ پھر مجھ کو معلوم ہے کہ کچھ فیض آفتاب سے ہوا، کچھ فیض آب سے اور ذرّات آآکر شریک ہوتے جاتے ہیں۔ مگر بنیادی اجزاء وہی ہیں جو خود زمین پیش کرتی ہے اُس پودے کے لئے۔

اب ہر صاحب فہم غور کرے کہ یہ زمین کے اجزاء جو اس پودے میں شامل ہوگئے، یہ اپنی حدودِ وجود میں فنا ہوئے۔ یعنی اب وہ خاک میں نہیں رہے۔ اب وہ مٹی میں نہیں رہے۔ جو ان کے وجود کا ذریعہ تھا، اس کے لحاظ سے وہ فنا ہوگئے۔ لیکن یہ فنا بلند تر بقا کا ذریعہ بنی۔ پہلے وہ خالی زمین تھی، اب جو ذرات خاک کے اس نبات کی ہستی میں شامل ہوگئے تو اب رزق میں اس کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اب جو اس پودے کی غذا ہوگی، وہ اس تک آپ پہنچائے گا۔

تو معلوم ہوا کہ یہ **فنا تمہید بقا بن گئی اور بقا فقط بقا نہیں بلکہ بلند تر بقا**۔ یعنی جب تک فنا نہیں ہوئے تھے، تب تک وہ جمادات میں داخل تھے اور جب فنا ہوگئے اس بلند تر کی خاطر تو انہوں نے ایک نوع کی سرحد کو طے کر کے دوسری نوع میں قدم رکھ دیا۔ یعنی اب وہ نباتات میں داخل ہوگئے۔

جمادات کی منزل سے آگے بڑھ گئے۔ اب یہ درخت کے پتے، یہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں، انہیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو کیا یہ باقی رہیں گی؟ نہیں تمازتِ آفتاب سے خشک ہو جائیں گی اور اگر ان صورتوں سے ختم ہو گئیں تو ہو گئیں لیکن اگر یہ کسی ذی روح کی غذا بن گئیں، کسی حیوان یا انسان کے کام آ گئیں تو فنا اب بھی ہوئیں لیکن یہ فنا بلند تر بقا کا ذریعہ بنی۔ یعنی وہ ایک حیوان کے جسم میں لہو بن کر دوڑنے لگیں۔

معلوم ہوا کہ جب اپنے سے بالاتر کے لئے فنا ہو تو وہ فنا اپنے سے ترقی یافتہ بقا کی شکل حاصل کرتی ہے۔ یہاں تک تو عقلائے زمانہ متفق ہیں۔ زمین نباتات کے کام آئے تو کسی کو اعتراض نہیں، نباتات حیوانات کے کام آئیں تو کسی کو اعتراض نہیں۔ اب ہے حیوان اور انسان کی منزل۔ یہاں بعض رحم دل جماعتوں کو رحم آتا ہے کہ حیوان کی قربانی انسان کے لئے کیوں ہو؟ یعنی زمین نباتات کے کام آئی، کسی کو رحم نہ آیا۔ نباتات حیوانات کے کام آئے تو کسی کو رحم نہ آیا۔ اب یہ حیوان کی قربانی انسان کی خاطر ہو رہی ہے تو اب رحم آنے لگا کہ اس کی یہاں زیادہ ضرورت نہیں ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ جذبۂ ترحم قابلِ قدر ہے، بحیثیت جذبے کے رحم یقیناً قابلِ قدر چیز ہے بشرطیکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جو جانور کی جان نہ لینا چاہے گا، وہ بھلا انسان کی جان کیوں لینا چاہے گا! بلاشبہ جذبۂ ترحم قابلِ قدر ہے لیکن اصول جذبات کے پابند نہیں ہوتے۔ اصولاً میرا سوال یہ ہے کہ زمین نباتات کے کام آئی تو ظلم نہ ہوا اور نباتات حیوان کے کام آئے اور انسان کے کام آئے تو ظلم نہ ہوا۔ حیوان انسان کے کام آ جائے تو ظلم ہو جائے گا، کیوں؟

وہ سب ظلم کیوں نہیں ہے اور یہ کیوں ظلم ہے؟ اس کا جو جواب ملے گا، وہ مجھے معلوم ہے کہ پتھروں اور زمین میں اذیت کا احساس نہیں ہے، انہیں درد اور دکھ سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ ظلم نہیں ہے اور نباتات کو تکلیف اور درد کا شعور نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ظلم نہیں ہے اور یہ حیوان بلبلاتا ہے، تڑپتا ہے، بے چین ہوتا ہے، لہٰذا یہ ظلم ہے۔

تو پہلے میں اصولاً یہ دریافت کروں گا کہ کیا ظلم کی بنیاد احساسِ اذیت پر ہے؟ ایک اصولی سوال ہے کہ کیا ظلم کی بنیاد احساسِ اذیت اور شعورِ تکلیف پر ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ڈاکٹر ہوش وحواس کے عالم میں آپریشن کر دے تو ظلم ہوگا اور کوئی قاتل بیہوش کر کے قتل کر دے تو ظلم نہیں ہوگا۔ تو دنیا کے قانونِ تعزیرات میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر قاتل ہوش وحواس کی حالت میں کسی کو قتل کرے تو ظلم ہے اور قابل سزا جرم ہے لیکن اگر کسی کو غشی کی حالت میں بیہوش کر کے قتل کر دے تو ظلم نہ ہوگا، جرم نہ ہوگا۔ جب ظلم نہیں تو جرم کیوں؟ لیکن دنیا کے قانونِ تعزیرات میں یہ شرط نہیں ہے۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ ہوش وحواس کی ضرورت ہے جرم کے لئے مگر قاتل کے ہوش وحواش کی ضرورت ہے، مقتول کے ہوش وحواس کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ کبھی زمین کو احساسِ اذیت، نہ کبھی نباتات کو شعورِ اذیت، آپ کو تو شعور ہے، آپ کو کیا حق ہے کہ پھولوں کو جلاوطن کیجئے؟ آپ کو کیا حق ہے کہ شاخوں کو قلم کیجئے؟ آپ کو کیا حق ہے کہ زمین کے سینے پر ہل چلایئے؟ آپ کو کیا حق ہے کہ اس کے اجزائے وجود کو منتشر اور تہ وبالا کیجئے؟ اُسے اذیت کا احساس نہ ہو، آپ کو تو ہے۔ آپ کیوں ایسا کرتے ہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ کسی وقت میں یہ کہا جاتا تھا کہ پودوں میں احساسِ اذیت نہیں ہے، تو قابلِ قبول تھا۔ جب ہمارے ہندوستان کے سائنس دان نے یہ انکشاف کر دیا کہ پودوں میں احساسِ اذیت ہے، احساسِ تکلیف ہے، پودوں سے بھی رونے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ ہاں! ہنسنے کی آواز کبھی کسی نے نہیں سنی، رونے کی آواز پودوں سے بھی سنائی دی اور پودے کو سانس لیتے ہوئے تو میں نے خود ایک نمائش میں دیکھا۔ اب جب ان سے ثابت ہو گیا کہ احساسِ اذیت ہے تو جب تک اطلاع نہیں تھی، تب تک تو خیر، مگر اس کے بعد سے تو نباتات سے بھی غذا حاصل کرنا موقوف ہونا چاہئے اب معلوم ہو گیا کہ انہیں بھی اذیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جیسی نمایاں اذیت حیوان کو ہوتی ہے، ویسی تو نباتات کو نہیں ہوتی۔ تو جب معلوم ہو گیا کہ ہوتی ہے تو چاہے نمایاں ہو، چاہے غیر نمایاں، اصولاً بات ایک ہی ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک خوردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک کوئی یہ کہہ لیتا کہ ہمارا اصول ہے کہ کسی ذی روح کو صدمہ نہ پہنچائیں گے۔ خوردبین ایجاد ہوئی تو پتہ چل گیا کہ ایک پانی کے قطرے میں کتنے ذی روح ہیں جو ہم پی لیتے ہیں تو اس کے نظامِ حیات میں خلل پڑتا ہے۔ ایک سانس جو ہم لیتے ہیں، اُس سے فضائے ہوا میں جو ذی روح مخلوق ہے، وہ کس قدر ہے جو ہمارے ایک سانس کا شکار ہو جاتی ہے۔ تو اس کے بعد تو اپنی زندگی تج دینا پڑے گی یا میرے ساتھ مل کر اس اصول کا قائل ہونا پڑے گا کہ اس نظامِ کائنات کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ہر ناقص کامل کے کام آئے اور یہ ناقص کی فنا نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس کے مقصدِ وجود کی تکمیل ہے۔

اب ظلم کا معیار مجھ سے سنئے کہ ظلم کی بنیاد احساسِ اذیت پر نہیں ہے، ظلم کی بنیاد اقدامِ ناحق پر ہے۔ یہ اقدام ناحق ذی شعور کے ساتھ ہوگا تو ظلم ہوگا اور غیر ذی شعور کے ساتھ ہوگا تو بھی ظلم ہوگ۔ اب دنیا کو یہ حقیقت خود معلوم نہ ہو تو ہمارے بتانے سے معلوم ہو جانی چاہئے کہ ہمارے نزدیک وہ حیوانات ذلیل ہیں جو انسان کی غذا نہیں بنتے اور وہ حیوان عزت دار ہیں، شریف ہیں، اپنی نوع میں، جو انسان کے کام آتے ہیں۔ یہ تفریق آخر کیوں ہے؟ ہر زمین اس لائق نہیں ہوتی کہ اس میں نباتات روئیدہ ہو سکیں۔ کچھ شورہ دار زمینیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں بیج ڈال دیئے جائیں تو جل کر خاک ہو جائیں۔ ہر پودا اس لائق نہیں ہوتا کہ اس سے حیوان کا تغذیہ ہو۔ بعض پودے ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ اگر حیوان اور انسان کھالے تو زندہ نہ رہ سکے۔ وہ کسی اور حیثیت سے انسان کے کام آئیں ، دوا وغیرہ میں، یہ اور بات ہے۔ خدا نے بیکار تھوڑی پیدا نہیں کئے ہیں۔ اسی طرح ہر حیوان کو نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ ضرور انسان کی غذا بن سکتا ہے۔ انسان کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں، ان سب میں جسمانی پہلو ہے۔ لہٰذا ان میں سے کون مفید ہے، کون مضر، یہ تجربہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ حیوانات کچھ زہریلے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لئے مضر ہیں لیکن انسان میں ایک مزاج روحانی بھی ہے۔ روحانی حیثیت سے کون اس کے لئے مفید ہے اور کون مضر، اسے یہ جسمانی اطباء و حکیم اور ڈاکٹر نہیں بتا سکتے۔ جنہوں نے روح ہی کو نہ سمجھا ہو، وہ مزاج روح کو کیا سمجھیں گے؟ لہٰذا اس کے لئے طبِ روحانی کی ضرورت ہے جس کا نام شریعت ہے۔ اس شریعت نے بتایا ہے کہ کون حیوان اس کے مزاج

اخلاق کے لئے سازگار ہیں، کون حیوان اس کے مزاجِ روحانی کے لئے مناسب ہیں، کون نامناسب؟ اس لئے حیوانوں میں تفریق ہوگئی، کچھ حرام جانور ہوئے، کچھ حلال جانور۔ اس کو فقہ کی زبان میں کہتے ہیں کچھ ماکول اللحم ہوئے، کچھ غیر ماکول اللحم ہوئے۔ اس کے بعد وہی دوا اور کیفیتِ استعمال کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے۔ بادام مسلّم کھایا جائے تو اور اثر اور اگر پیس کر کھایا جائے تو اور اثر۔ جتنا باریک پیسا جائے، اُتنا زیادہ مقوی، کوئی جز گھٹا بڑھا نہیں، وہی ایک چیز ہے، کیفیتِ استعمال کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے۔ اس طرح کوئی تعجب نہ کیجئے کہ حیوان جو ذاتی طور پر حلال لیکن ایک خاص طرح سے اس کے رگ ہائے گردن قطع ہوں، تب وہ حلال رہے گا اور اگر کسی طرح چوٹ کھا کر مر جائے تو زندگی میں حلال تھا مگر اب وہ حرام ہوگیا۔ یعنی کیفیت کے بدلنے سے اثر بدل گیا۔

ایک تجربہ مجھے ہندوستان میں ہوا۔ کانپور چمڑے کے کاروبار کا مرکز ہے۔ وہاں چمڑے کے کاروبار کرنے والوں نے ایک بات مجھے بتائی کہ ہم تو چمڑے کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ذبیحے کا ہے یا نہیں۔ اب ہر صاحب فہم غور کرے کہ خون کا تعلق کھال سے اتنا نہیں ہے جتنا گوشت سے ہے۔ جب ذبح کرنے سے کھال کی کیفیت میں فرق آجاتا ہو تو گوشت کی خاصیت میں فرق ہوجائے تو حیرت کی کیا بات ہے۔ تو جو روح سے واقف تھے، انہوں نے بتایا کہ اس طرح سے ذبح ہو تو حلال ہوگا اور اس طرح سے ذبح ہوگا تو پھر حرام ہوگا۔ اب اگر وہ ذاتی طور پر بڑا معزز حیوان تھا لیکن چونکہ اس کی موت اس طرح سے نہیں ہوئی کہ وہ اپنے سے مافوق یعنی انسان کے کام آسکے تو اب وہ

ذلیل ہوگیا، پھینکنے کے قابل ہوگیا۔

اب ایک حقیقت کی طرف اشارہ کروں کہ اگر وہ اس طرح گیا کہ غذائے انسان بن سکے تو وہ میت نہیں ہے، اس کا نام ہے ذبیحہ۔ موت سے تو میت کا لفظ ہے مگر میت کہنا اس کو غلط۔ میت وہی جس کی خرید وفروخت ناجائز ہو۔ اس کا نام ذبیحہ ہے اور فقط نام کا فرق نہیں ہے، احکام کا بھی فرق ہے۔ اگر ذبیحہ ہے تو طاہر ہے اور حلال۔ اگر میت ہے تو جونہی جسم سرد ہوا، نجس ہوگیا۔ چاہے کتنا ہی صاحب اوصاف انسان ہو۔ زندگی میں تعظیم کو کھڑے ہو جاتے ہوں لیکن جونہی جسم سرد ہوا، نجس ہوگیا اور فقہ جعفریہ کی رُو سے اور نجاستوں سے بڑی نجاست۔ کسی دوسری نجاست کو اگر چھو لیجئے تو صرف ہاتھ پاک کرنا ہوگا۔ وہ بھی تری کی صورت میں، لیکن میت کو اگر چھو لیں تو تری کی شرط نہیں ہے، ہاتھ بھی خشک ہے، جسم بھی خشک ہے لیکن پھر بھی وہی حکم اور فقط ہاتھ کا پاک کرنا نہیں بلکہ غسل واجب ہوگا۔

یہ شرفِ انسانی کا رخنہ ہے کہ وہاں بھی نجاست تھی اور یہاں سخت تر نجاست آئی۔ لیکن اس نجاست کے دفع کرنے کی کوئی ترکیب نہیں تھی لیکن یہاں قربۃً الی اللہ ایک عبادت کردو یعنی غسل دے دو۔ دس دفعہ سمندر میں غوطے دیدیجئے تو پاک نہیں ہوگا، جب تک قربۃً الی اللہ کی نیت نہ ہو۔ نہلانا نہیں ہے، غسل دینا ہے۔ وہ نہلانا جو قربۃً الی اللہ ہو اور اسی ترکیب سے ہو جو اُدھر سے مقرر ہوئی ہے، اس طرح سے ہو تو پھر پاک ہوگا۔ پس یہ غسل اس نجاست کو دفع کرتا ہے جو موت کی وجہ سے آئی ہو۔ لیکن اگر شہید ہے تو غسل کی ضرورت نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دم نکلنے کے ساتھ نجاست

نے قدم ہی نہیں رکھا۔ جیسے وہ زندگی میں طاہر تھا ویسے ہی روح نکلنے کے بعد طاہر رہا اور اتنا ہی نہیں کہ غسل ضروری نہیں، کفن بھی ضروری نہیں ۔ اسی لباس میں اُسے دفن کر دو بلکہ لباس سے اس خون کے چھڑانے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو میدانِ جنگ میں بہا تھا کیونکہ یہ خون شہیدانِ راہِ خدا کی زینت ہے۔

اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جن کے سامنے راہِ خدا میں موت کا یہ انجام ہو، کیا وہ موت سے ڈریں گے؟ اسی کا نتیجہ یہ کہ جوانی کا زمانہ تیئیس (۲۳) سال کی عمر۔ یہ عنفوانِ شباب کہلاتا ہے۔ جب زندگی بہت مرادوں والی ہوتی ہے۔ دل تمناؤں کا مرکز ہوتا ہے۔ مگر اس ۲۳ برس کی عمر میں پیغام ملتا ہے کہ بستر پر سور ہو، نیزوں کے حصار میں اور تلواروں کے محاصرے میں، تو فوراً سجدۂ شکر ادا کیا جاتا ہے یعنی وہ موت جیسے حاصلِ حیات ہو۔ تو جو اس موت کو موت سمجھے گا، وہ رنجیدہ ہوگا اور جو اس موت کی حقیقت سے واقف ہے کہ یہ موت بلند تر زندگی ہے تو وہ تو اسے اپنے لئے ایک نعمت سمجھتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو صحیح سلامت اٹھنے پر سجدۂ شکر کرتا مگر انہوں نے بڑے بڑے معرکوں سے واپس آنے پر بھی سجدۂ شکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس زندگی کو اصل زندگی سمجھتے ہی نہ تھے۔ اصل زندگی وہی تھی جو مقصدِ زندگی بن سکے۔

یہ زندگی ذریعہ ہے اُس زندگی کا۔ تو جو اس زندگی کو اصل زندگی سمجھتا ہو، وہ بھلا اس زندگی کی بقا پر کیوں سجدۂ شکر کرے گا! پیغمبر خدا نے ماہِ رمضان کی آمد کے موقع پر خطبہ ارشاد فرمایا:

"قَدْاَقْبَلَ اِلَیْکُمْ شَهْرُ اللّٰهِ بِالْبَرَکَتِهٖ وَالرَّحْمَتِهٖ

والْمَغْفِرَتُه" (مفاتیح الجنان تھوڑے فرق کے ساتھ)

"تمہاری طرف اللہ کا مہینہ آ رہا ہے، رحمت کے ساتھ، مغفرت کے ساتھ، مرضیِ الٰہی کے ساتھ"

"شَهْرٌ هُوَ عِنْدَاللّٰهِ اَفْضَلُ الشُّهُوْرِ"

"وہ مہینہ جو اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل ہے"

تو اسی طرح بہت سے فضائل ماہِ رمضان کے بارے میں بیان کیے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی خطبہ میں موجود تھے۔ انہوں نے ایک سوال کیا تو رسول ﷺ نے اس کا جواب دیا۔ اس سوال و جواب کی وجہ سے رسولِ خدا حضرت علیؑ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو فرمایا:

"كَيْفَ صَبْرُكَ يَاعَلِيُّ"

یا علیؑ! تمہارے صبر کا عالم کیا ہوگا، جب اس مہینے میں تمہارے سر کو زخمی کر کے تمہاری ریش کو خضاب کیا جائے گا؟

یہ متفق علیہ ہے، آپؐ نے قاتل کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "اَشْقَى الْاُمَّةِ" ، اُمت میں سے شقی ترین انسان اٹھے گا اور تمہارے سر کو زخمی کر کے خون سے خضاب کر دے گا۔ رسول نے گویا آزمائشی سوال کیا تھا کہ تمہارا صبر کیسا ہوگا؟ علیؑ جواب نہیں دیتے بلکہ ایک سوال کرتے ہیں:

"اَذَالِكَ فِيْ سَلَامَةٍ مِنْ دِيْنِيْ"

کیوں یا رسول اللہ! یہ میرے دین کی سلامتی کے عالم میں ہوگا نا؟

اب ہمیں محسوس کرنا چاہیے سلامتی دین کی نزاکت کہ علی پوچھ رہے ہیں "اذالک" یہ اصول کا اعلان ہے کہ ہر موت پسندیدہ نہیں ہے۔ جو موت

محبوب ہے، اس کا معیار ظاہر کرتا ہے کہ "اذالک فی سلامة من دینی"۔ یہ میرے دین کی سلامتی کے عالم میں ہوگا نا؟ اور رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں ہاں یا علی! اس میں کیا شک؟ دین کی سلامتی کے عالم میں ہوگا۔

تو اب علی علیہ السلام جواب دیتے ہیں۔ سوال یہی تھا کہ صبر کیسا ہوگا؟ علی جواب دیتے ہیں:

"اِذْ لَيْسَ هُوَ مِنْ مَوَاقِعِ الصَّبْرِ بَلْ هُوَ مِنْ مَوَاقِعِ الشُّكْرِ"

پھر وہ وقت صبر کا نہیں ہوگا بلکہ وہ وقت شکر کا ہوگا۔

دیکھئے جب قاتل کی تلوار لگی تو

"فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَة"

انداز شکر کا ہے، قسم کے ساتھ کہا: پروردگار کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوا۔

مجھے اس سلسلے کا ایک اور علی نظر آتا ہے وہ کون علی اکبر۔ وہاں گفتگو تھی رسول اور علی کے درمیان اور یہاں گفتگو ہے حسینؑ اور علی اکبر کے درمیان، وہ دادا تھے جو علی تھے اور یہ پوتا ہے جو علی ہے اور تقریباً اتنی ہی عمر ہے جو ہجرت میں ان کی تھی ۲۳ برس کی عمر حضرت علی کی تھی اور جناب علی اکبر کے بارے میں مشہور روایت اٹھارہ برس اور بہت سے علماء کی تحقیق میں ۲۵ برس۔ اٹھارہ برس ہے تو ابتدائے جوانی ہے اور پچیس برس ہے تو کمال جوانی ہے۔ راہ کربلا ہے اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی اکبر حسینؑ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ حسینؑ تھوڑی دیر کے لئے سو گئے تھے اور جب ان کی آنکھ کھلی تو زبان

پڑھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ ۔ یہ کلمہ ہے جو مصیبت کے وقت قرآن کی ہدایت کے مطابق اہل ایمان زبان پر جاری کرتے ہیں علی اکبر نے عرض کیا کہ بابا اس وقت اس کلمے کے زبان پر جاری کرنے کا کیا سبب ہوا۔ اب آپ بتائیں گے کہ آپ نے خواب دیکھا تھا تو میں بارگاہِ حسینی میں عرض کروں گا کہ خواب آپ نے دیکھا تھا حضرت علی اکبر کو سنانے کی ضرورت کیا ہے۔ مجملاً کوئی جواب دے دیجئے، لیکن امام حسینؑ میرے جواب میں شاید فرمائیں کہ اگر ابراہیم نے اسمٰعیل سے خواب نہ بیان کیا ہوتا تو میں بھی علی اکبر سے بیان نہ کرتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ابراہیم اسمٰعیل سے خواب بیان نہ کرتے تو قربانی فقط کارنامہ ابراہیم ہوتی کارنامہ اسمٰعیل نہ ہوتی۔ لیکن جب اسمٰعیل سے خودمختارانہ طور پر بیان کر دیا اور انہوں نے کہہ دیا کہ یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین. جو حکم ہو رہا ہے اس کی تعمیل کیجئے آپ مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ تو اب کارنامہ دونوں کا ہو گیا باپ کا بھی اور بیٹے کا بھی۔ ویسے ہی امام حسینؑ نے جو خواب دیکھا تھا وہ بیان نہ کرتے حضرت علی اکبر سے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ علی اکبر اسمٰعیل کی طرح اپنے عزم کو ظاہر نہ کر سکتے۔ وقت پر مصیبت آتی تو لوگ کہتے کہ اتفاقی ہنگامی صورت حال تھی کہ جو پیدا ہو گئی۔ مولا خلیل کربلا ہیں اپنے ذبیح سے اس خواب کو بیان فرما دیتے ہیں۔ وہی انداز امتحان ہے کہ کیف صبرک۔ تمہارا صبر کیسا ہو گا۔ وہی انداز جو ابراہیم کے ہاں تھا۔ کہ یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے حکم ہوا ہے۔ کہا یہ ہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ وہ سنت ہے وہی انداز ہے کہ یہ اپنے ذبیح کے سامنے خواب کہہ کر بیان فرما رہے ہیں

اور بطور تصور مصیبت اِنّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ بھی فرمایا ہے یہ سب تمہید ہے علی اکبر سے جواب سننے کی۔ علی اکبر نے پوچھا کہ آپ نے اس وقت یہ کلمہ زبان پر کیوں جاری فرمایا میں نے ابھی ابھی خواب دیکھا کہ یہ صدا آرہی ہے کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کے ساتھ ساتھ جا رہی ہے۔ جیسے حضرت علیؑ نے رسول اللہ کو ایک دم جواب نہیں دیا تھا بلکہ پوچھا تھا کہ کیا یہ میرے دین کی سلامتی کی حالت میں ہوگا۔ بالکل اسی طرح حضرت علی اکبر نے سوال کیا کہ کیوں بابا ہم حق پر تو ہیں۔ یہ بتا دیجئے کہ ہم حق پر تو ہیں تو حسینؑ فرماتے ہیں۔ بل الذی مرجع العباد. ہاں ہاں قسم اس کی جس کی طرف سب کو جانا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ جب یہ سن لیتے ہیں تو حضرت علی اکبر ارشاد فرماتے ہیں کہ بابا پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے۔ حق پر ہم دنیا سے جا رہے ہیں تو ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے۔ اب یہ تو علی اکبر ہیں انتہائے سن کمال پر مگر مجھے شوقِ موت میں ایک بچے کی صدا آتی ہوئی فضائے تاریخ سے سنائی دیتی ہے۔ وہ بچہ کون۔ کربلا کے مجاہدین میں جو میدان جہاد میں جا کر جنگ کر کے شہید ہوئے ہیں کسی کے بارے میں نہیں ملتا کہ وہ بچہ ہو سب جوان تھے۔ لیکن ان کے لئے۔ کس کے لئے یتیم حسن کے لئے صراحت ہے کہ یہ حدِ بلوغ تک نہیں پہنچے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ شریعت اسلامی میں پندرہ برس کی عمر میں بلوغ ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پندرہ برس کی عمر نہیں تھی۔ کیونکہ امام حسنؑ کی وفات اور کربلا کے واقعہ میں دس برس کا فاصلہ ہے اس لئے آپ کا کوئی فرزند اس سے کم نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر میں کتاب مقاتل میں ایک اور شہید عبداللہ ابن حسنؑ کا تذکرہ ملتا ہے ان کی صورت حال سے ظاہر ہے کہ

جناب قاسم سے چھوٹے تھے اس لئے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جناب قاسم کی عمر کربلا میں تیرہ برس کی تھی مگر آثار کم سنی اتنے تھے کہ جب مدینہ سے چلے ہیں تو بی بیوں کے ساتھ محمل میں بٹھا دیے گئے تھے۔ ان کو کوئی مرکب سواری کے لئے نہیں دیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حسرت تو کربلا میں پوری ہوگئی کہ شاید وہ پہلی سواری تھی جو منزل شہادت تک لے کر گئی۔ اور کم سنی کی وجہ سے یہ ہوا کہ جو میدان جنگ میں گیا اس کے جسم پر زرہ تھی لیکن جناب قاسم میدان جنگ میں گئے تو ان کے جسم پر ایک کرتہ تھا۔ چرچا واقعہ کربلا کا اکثر گھر میں ہوتا رہتا تھا جب رسول اطلاع دے چکے تھے تو گھر والوں کے لئے یہ راز راز نہیں تھا۔ تو جب چرچا ہوتا تھا تو خاندان رسالت کا بچہ جانتا ہے کہ جہاد میں عمر کی قید ہوتی ہے۔ زیادتی عمر کی قید نہیں ہے مگر اس طرف کی کی حد میں قید ہے۔ بہت سے بچے جوش میں بدر میں آنا چاہتے تھے رسول واپس کر دیتے تھے کہ یہ بچہ ہے ابھی اس لائق نہیں ہے کہ اسے جہاد میں لایا جائے۔ قاسم چونکہ کم سن تھے اس لئے نہ جانے کب کب ان کو فکر ہوتی تھی کہ کہیں میری کم سنی میری بدنصیبی کا باعث نہ ہو جائے جب شب عاشور مولا نے خطبہ پڑھا کہ کل روز قربانی ہے اور جسے میرا ساتھ چھوڑ کر جانا ہو تو وہ چلا جائے اور یہاں تک فرما دیا کہ میرے عزیزوں کا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لو یعنی کوئی عباس کو ساتھ لے جائے۔ کوئی علی اکبر کو ساتھ لے جائے۔ مولا نے اگر یہ جملہ نہ کہا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ سب سے پہلے مسلم ابن عوسجہ کھڑے ہوتے مگر چونکہ مولا نے یہ جملہ کہہ دیا اس لئے اصحاب کشمکش میں پڑ گئے کہ کیا جواب دیں۔ مولا نے گویا ایک کام بھی سپرد کر دیا۔ اب کہیں کہ جائیں گے یا نہیں جائیں گے۔ اس رکاوٹ کو ابوالفضل

العباسؑ نے کھڑے ہو کر دور کیا۔ اور سب عزیزوں کی طرف سے عرض کیا ۔عجیب انداز ہے۔ عزیز بھی سب آواز ملا رہے تھے۔ کہا کہ مولا یہ آپ نے کیا کہہ دیا آپ کا ساتھ چھوڑ دیں اس لئے کہ زندہ رہیں۔ خدا کی قسم وہ زندگی ہمارے لئے موت سے بدتر ہے جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر ہو۔ پھر اصحاب نے اپنے خیال پیش کئے وہ عرض نہیں کرنے ہیں موضوع کی مناسبت سے ایک فقرہ کہوں گا کہ یہ زندگی دنیا جیسی کربلا میں ذلیل ہوئی ہے ایسی کہیں ذلیل نہیں ہوئی ۔مولا ان کی زندگیاں واپس کر رہے تھے کہ مجھے ان زندگیوں کی ضرورت نہیں ہے اور وہ آپ کے قدموں میں ڈال رہے تھے کہ ہمیں بھی اس زندگی کی ضرورت نہیں ہے۔

ارباب عزا اب قاسم کھڑے ہوئے ۔مدت کا جو تردد تھا اسے دور کرنے کا موقع مل گیا انہوں نے پوچھا چچا کل یہ سعادت ہمیں بھی نصیب ہوگی امام نے ارشاد فرمایا۔ جواب نہیں دیا ایک سوال کر لیا۔ یا بنی کیف الموت عندک۔ ارے بیٹا یہ تو بتاؤ کہ موت تمہارے نزدیک کیسی چیز ہے۔ لیجئے امام کا سوال ہے اور امتحانی ہے۔ خدا کی قسم فلاسفہ کا کلام ہم نے دیکھا ۔لیکن حقیقت جو قاسم نے بتائی ہے یہ فلاسفہ کے کلام میں نہیں ملی آپ بھی میرے ساتھ غور کر لیجئے کہ قاسم کے جواب سے کم سنی ٹپک رہی ہے مگر حقیقت وہ بتائی ہے جو فلسفیوں نے نہیں بتائی کسی نے موت کا مزہ نہیں بتایا۔ جس نے بھی بتایا ہے تلخ بتایا ہے۔ قاسم جو جواب دیتے ہیں وہ کم سنی میں ڈوبا ہوا ہے کہ یا عمی احلی من العسل ارے چچا وہ تو شہد سے زیادہ میٹھی چیز ہے۔

بس ارباب عزا پتہ چل گیا کہ شہزادے کو شہد بہت پسند تھا کہا چچا وہ تو شہد سے زیادہ شیریں چیز ہے۔ اب مولا نے جواب دیا صاحبان فہم غور کریں کہ جو چیز وجہ تردد ہوتی ہے اس کی قوی تر مثال پیش کردی جائے تو اطمینان ہو جاتا ہے میں نے جیسا پس منظر عرض کیا اس سوال و جواب کا۔ تردد کم سنی کا تصور تھا کہ میں بچہ ہوں اس لئے مولا کو اطمینان دلانا ہے فرماتے ہیں کہ اے قاسم کل تو وہ دن ہے کہ تمہارا کیا ذکر تمہارا ننھا بھائی چھوٹا بھائی علی اصغر وہ بھی اس سعادت کو حاصل کرے گا۔ بس ارباب عزا قاسم کو اپنے بارے میں تو اطمینان ہو گیا لیکن علی اصغر کا جو نام لے لیا تو ایک دفعہ قاسم کا ذہن اور طرف چلا گیا کہنے لگے چچا کیا یہ اشقیا خیموں کے اندر جائیں گے۔

# فلسفۂ شہادت

# دوسری تقریر

- اہل دنیا کس لئے جان دیتے ہیں:

☆ دولت کی خاطر جو انسان سے ۳ درجے پست ہے۔

☆ قیمتی اسے مانا جاتا ہے جو نایاب یا کمیاب ہو۔

☆ خالق نے ضروریات زندگی کو وافر رکھا ہے۔

☆ کمیونزم پر تنقید

☆ عدل اور مساوات پر بحث

☆ سلطنت کی خاطر

☆ جمالِ فانی کی خاطر

☆ میدانِ حیات سے فرار (خودکشی)

☆ طبعی موت

- شہید خطرے کو محسوس کر کے مقصد کی خاطر قربانی دیتا ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ (آل عمران 3/169)

''جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں''۔

جمادات، نباتات، حیوانات، سب میں یہ اصول کارفرما ہے کہ اپنے سے بالاتر کی خاطر زندہ کا خاتمہ ہو تو فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک بلند تر بقا حاصل ہوتی ہے۔ جمادات نباتات کے کام آتے ہیں۔ نباتات حیوانات کے کام آتے ہیں۔ حیوانات انسان کے کام آتے ہیں۔ اب انسان اگر قربانی پیش کرے گا تو اس کے لئے جو اس سے بالاتر ہو، اس سے اونچا ہو۔ لیکن اہل دنیا جس جس چیز کی خاطر جان دیتے ہیں، وہ سب انسان سے پست ہیں۔ تو جو انسان سے پست تر چیز کے لئے قربانی دے رہا ہے، اسے بقا کیونکر مل سکتی ہے؟ اس کے مرتبہ میں بلندی کہاں آسکتی ہے۔

ذرا دیکھئے! عام انسان کن کن چیزوں کی خاطر جان دیتے ہیں۔ کتنے ہیں جو دولت کی خاطر جان دیتے ہیں تو دولت کیا چیز ہے؟ انسان سے تین درجہ پست۔ یعنی انسان کے نیچے حیوانات، حیوانات کے نیچے نباتات، نباتات کے نیچے جمادات اور دولت کی جتنی اقسام ہیں، وہ سب جمادات میں داخل ہیں۔ اصل دولت تو حضور سونا ہے۔ اسے اس وقت کے لوگ بھی جانتے تھے جب معاشیات نے فن کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے

کہ اصل دولت کو کہتے ہیں اصل زر اور زر کے معنی سونا ہیں۔ آپ کے ہاں محاورہ ہے کہ یہ بات حروف زرین سے لکھنے کے قابل ہے۔ حروف زریں کون؟ یعنی سونے کے حروف سے۔ زر کے معنی سونا اور اصل دولت اصل زر۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات پرانے زمانہ کے لوگ جانتے تھے کہ اصل دولت سونا ہے۔ موجودہ دور میں بھی اصولِ معاشیات میں یہ حقیقت تسلیم کی گئی ہے۔ کاغذ کا اطلاق تو سونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کاغذ چل رہا ہے اور سونے کا ذخیرہ موجود نہیں ہے تو اس حکومت کا کوئی معاشی بھرم نہیں ہے یعنی اس حکومت کا اقتدار کاغذ کی ناؤ ہے اب بھی وہی بات قائم رہی کہ اصل دولت سونا ہے۔ پرانے زمانے میں بھی اور آج کل بھی دولت مندوں میں اور قسم کی دولت بھی ہوتی ہے مثلاً جواہرات۔ اس میں سب سے قیمتی ہیرے یاقوت زمرد۔ چاہے جتنی خصوصیات بڑھا دیجئے، رہیں گے وہ پتھر ہی۔ تو جتنی دولت کی قسمیں ہیں وہ در حقیقت یہی ٹھوکروں میں آنے والے پتھر ہیں۔ یہ تو رنگ ساز کی بات ہے کہ کسی کو ذرا شوخ رنگت دیدی۔ آپ نے نام رکھ دیا یاقوت۔ کسی کو اور چمک دے دی۔ آپ نے کہہ دیا سونا۔ کسی اور رُخ سے جاذب نظر بنا دیا آپ نے کہہ دیا چاندی۔ یہ سب نام آپ نے رنگتوں کے لحاظ سے رکھے ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب پتھر ہیں اور ہماری نظر میں قیمتی کیوں ہو گیا۔ اس لئے کہ ہم نے قیمت کا معیار کارآمد ہونا نہیں رکھا ہے بلکہ کمیاب اور نایاب ہونا رکھ لیا ہے۔

نظام تخلیق الٰہی یہ ہے کہ جتنی زیادہ کوئی چیز حیات کے لئے ضروری ہے، وہ اتنی ہی زیادہ پیدا کی گئی ہے اور جو چیزیں روزمرہ کام میں آنے والی

نہیں ہیں، انہیں ذرا دور رس اور کمیاب بنا دیا ہے۔ مثلاً سب سے زیادہ زندگی کے لئے ہوا ضروری ہے تو ہوا ہر جگہ موجود ہے۔ آپ ہوا سے بھاگیں گے بھی تو ہوا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گی اور چونکہ زندگی اس پر موقوف ہے، لہٰذا ہوا کو محتاج ذرائع بھی نہیں بنایا۔ ہوا کو حاصل کرنے کے لئے نہ ڈول کی ضرورت ہے نہ رسی کی، سانس کی آمد و شد۔ یہی صالح ہوا کے جذب کرنے کے لئے، یہی فاسد ہوا کے اخراج کے لئے۔ ضرورت کو جزوِ حیات بنا دیا۔

دوسرے درجے پر پانی ہے جتنی دیر ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اتنی دیر پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ تو پانی کو مقدار میں دوسرے درجے میں پیدا کیا گیا ہے۔ ہر جگہ موجود لیکن زمین کی تہوں کے نیچے، کہیں قریب ہے کہیں دور ہے اور پھر ذرائع کا محتاج۔ پانی کے لئے مشہور ہے کہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔ یہ خدائے حکیم کا عمل ہے کہ زندگی قائم رہے مگر بیکاری کی عادت نہ پڑے۔ جس کے بغیر زندگی وفا نہیں کر سکتی، اس کو کوشش کا محتاج قرار نہیں دیا اور وہ ہوا ہے۔ جس چیز کے بغیر زندگی وفا کر سکتی ہے، سعی و عمل کے سبب، وہ بغیر انسانی کارگزاری اور سعی و عمل کے حاصل نہیں ہوگی۔ جب انسان اس کے لئے کوشش کرے گا، تب وہ نتیجہ اس کے لئے حاصل ہوگا۔ لہٰذا اس کے لئے ذرائع قرار دیئے۔ لیکن وہ اتنے طویل المیعاد نہیں ہیں۔

تیسرے نمبر پر غذا ہے، وہ طویل المیعاد کوششوں سے وابستہ کی گئی ہے۔ زراعت کرو، بوؤ، جوتو، محنت کرو، اس کے بعد غذا حاصل ہوگی۔ پس! اسے محتاجِ ذرائع بنایا۔ یہ ہماری ضرورتوں کا لحاظ وہ کر رہا ہے جسے خود کوئی

ضرورت نہیں ہے۔ جن چیزوں کو عام نظامِ حیات کے لحاظ سے اس نے بیکار جانا تھا، ان کو سمندر کی تہوں میں چھپا دیا۔ پہاڑوں کے جگر کے اندر پوشیدہ کر دیا۔ انسانوں نے کوہ کنی کی، غوطہ زنی کی، سونا اور موتی حاصل کیے، خالق نے اپنے لئے تو کوئی چیز پیدا نہیں کی، سوائے انسان کے کہ ساری چیزیں انسانوں کے لئے اور انسان اس کے لئے۔

اس بنا، پر تم جا کر جتنے موتی نکالو، پہاڑوں سے کھود کر جتنے ذخیرے برآمد کرو، تو وہ سب تمہارے۔ تمہارے دامن میں جتنی گنجائش ہو، کوئی دنیا کا ملک کہتا ہے وہ میرے۔ اللہ کہتا ہے کہ جو جا کر لائے، اس کے۔ جو محنت کرے، اس کے۔ جتنا سونا چاندی پہاڑوں میں سے نکال لو، جو نکال کر لائے، اس کا۔ بس شرط یہ ہے کہ سرکاری حق یعنی خمس ادا کر دے تا کہ پتہ چل جائے کہ باغیِ سلطنتِ الٰہی نہیں ہے۔

اسی سے اس بحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اشتراکیت اور اسلام یا کمیونزم اور اسلام۔ ایک بہت بڑا سوال جو پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ **دولت مند اور غریب کا فرق کیونکر پیدا ہوا؟** ضرور کچھ لوگوں نے دوسروں سے چھین کر قبضہ کیا، لہٰذا وہ دولت مند ہو گئے اور کچھ لوگ بیچارے تھے، انہوں نے قبضہ نہیں کیا یا ان کی دولت کو دوسروں نے چھین لیا، لہٰذا وہ غریب ہو گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس فرق کی بنیاد غصب پر قائم ہے، لہٰذا دولت مندوں سے چھین لو اور غریبوں میں تقسیم کر دو کیونکہ شروع میں نہ کوئی امیر تھا، نہ کوئی غریب تھا سبھی برابر تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس فرق کا کوئی جائز سبب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ

کیسے ہو گیا کہ ایک لکھ پتی ہے اور دوسرا مفلوک الحال ہے اگر اسلام اس کا جائز ابتدائی سبب بتادے تو یہ سوال ختم ہو جائے گا۔ جب ایک جائز ذریعہ موجود ہو تو یہ فرض کرنا کہ ضرور غصب کیا گیا ہوگا، یہ پوری نوع انسانی کے ساتھ بدگمانی ہے۔

حضور والا! اسلام میں جائز ذریعہ یہ ہے کہ جتنا جا کر لے آئے گا، وہ اس کا۔ فرض کیجئے کہ جنگل ہیں، میدان ہیں، ابھی کسی کی ملکیت نہیں، جتنا کوئی جا کر اپنے قبضہ میں لا کر تصرف کرے گا، وہ اس کا ہو جائے گا۔ جو جتنے موتی لے آئے گا، وہ اس کے ہو جائیں گے۔ جو محنت کر کے برآمد کرے گا، جتنا سونا چاندی لے آئے گا، وہ اس کا ہو جائے گا۔ اصل مالک نے اعلان کر دیا۔ اب اس کے بعد کچھ تھے کام چور، کچھ تھے محنت سے گھبرانے والے۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ یہ دیکھتے رہے کہ کون یہ سب محنت کرتا ہے؟ پھر کسی صورت سے ان سے حاصل کر لیں گے۔ کچھ محنت سے نہ گھبرانے والے تھے، انہوں نے کوشش کی۔ اب یہ دوسرا گروہ جو ہے، اس نے دیکھا کہ یہ اتنا لے آئے ہیں، اب ان کو ضرورت ہوگی کام کاج کی، ہم جا کر مزدوری کر لیں اور اپنا پیٹ پال لیں۔ اس طرح سرمایہ دار اور مزدور کا فرق بغیر غصب کے پیدا ہو گیا۔ یعنی ان کی بلند ہمتی اور ان کی پست نگاہی سے۔ ان کی جدوجہد اور ان کی کاہلی سے۔ محنتی لوگوں کی نسلیں بھی محنت کرتی رہیں۔ مزدوروں کی اولاد بھی مزدوری پر قناعت کرتی رہی۔ لہٰذا فرق بڑھتا گیا۔

تو جب ایک معقول ذریعہ موجود ہے تو آپ یہ کیوں فرض کرتے ہیں کہ یہ تمام دولت مند غاصب ہیں؟ آپ اس قافلے میں بہت مدت کے بعد شامل

ہوئے ہیں ماضی کی جدوجہد کا آپ کو پتہ نہیں ہے۔ حال کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک دولت مند ہے اور ایک غریب ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ انصاف کے خلاف ہے۔ برابر سے تقسیم کردیں۔ مثال لیجئے کہ ایک درس گاہ میں دو طالب علم ایک ہی عمر کے داخل ہوئے، ایک ہی تاریخ کو۔ ایک محنتی تھا۔ وہ کسی سال فیل نہیں ہوا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ ایک تھا کام چور۔ اس نے ایک ایک درجہ کئی کئی برس میں طے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہنچ گیا وہاں، یہ رہ گیا یہاں۔ یہ چھٹے ساتویں درجہ میں رہ گیا، وہ ایم اے میں پہنچ گیا۔ اب کوئی انسپکٹر صاحب آئے۔ انہوں نے دونوں طالب علم دیکھے۔ ایک ہی قد وقامت کے، ایک ہی عمر کے۔ دونوں کے درجے پوچھے۔ انہوں نے پوچھا کب داخل ہوئے تھے؟ دونوں نے تاریخ بتائی۔ منتظمین سے تصدیق کے لئے رجسٹر منگوایا۔ واقعی دونوں ایک ہی تاریخ میں داخل ہوئے تھے۔ انسپکٹر صاحب مساوات پسند تھے۔ انہوں نے یہ کہا کہ ایک ہی تاریخ کو دونوں داخل ہوئے تھے۔ یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایک ایم اے کی کلاس میں پہنچ جائے اور ایک ساتویں آٹھویں درجہ میں رہ جائے۔ کہا: آٹھویں والے کو ایم اے میں لے جائیں گے تو چلے گا نہیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایم اے والے کو کھینچ کر آٹھویں میں داخل کردو۔ تو مساوات تو ہوگئی مگر کیا مساوات کے ساتھ انصاف بھی ہوا۔

تو یاد رکھئے کہ اسلام عدل کا دین ہے، مساوات کا دین نہیں ہے۔ ہر ایک نے محسوس کرلیا کہ یہ مساوات ظلم ہے۔ یہ عدالت کا تقاضا نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی محنت سے وہاں پہنچا ہے اور یہ اپنی بے عملی سے یہاں رہ گیا ہے۔ اب ان کو برابر کردینا انتہائی ظلم ہے۔ یہ اس دور کے مساوات پسند ہیں۔

انہوں نے مدرسۂ کائنات میں آنکھ کھولی ہے۔ اس وقت جب ایک عرصہ سے یہ عمل کے درجے طے ہو رہے ہیں۔ یہ حال کو دیکھ رہے ہیں کہ ایک وہاں ہے اور ایک یہاں ہے۔ ایک فقیر ہے اور ایک لکھ پتی ہے۔ ان کے بس میں تو یہ ہے نہیں کہ غریب کو امیر بنا دیں۔ بس یہی کر سکتے ہیں کہ امیر کو کھینچ کر غریب بنا دیں۔ تو اگر وہ ظلم ہے تو یہ بھی ظلم ہے۔ ہاں! جس کے بارے میں پتہ چل جائے، آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس نے غصب کے ذریعہ سے دولت حاصل کی ہے، بے شک اس سے چھین لیجئے مگر چھین کر کیا کیجئے؟ پتہ لگایئے کہ کن کن کا مال ہے، ان تک پہنچایئے۔ یہ نہیں کہ چھین کر اپنے منظورِ نظر افراد میں تقسیم کر دیں۔ اس طرح تقسیم کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک غاصب ختم کر کے آپ نے اپنے پاس سے بہت سے غاصب پیدا کر دیئے۔

تو یہ دنیا کی نادانی ہے۔ اسلام نے پہلے ہی اعلان کر دیا کہ جو جتنا عمل کرے گا، اس کا اتنا ہی ہو جائے گا۔ جب محنت کی اور پہاڑ میں سے سونا نکالا تو کہا کہ اس کی اتنی قیمت۔ دریا میں سے جو کچھ نکالا، کہا کہ اس کی اتنی قیمت۔ تو قیمت کا معیار کارآمد ہونا نہیں ہے، کمیاب ہونا ہے۔ نظامِ فطرت اس پر ہے کہ جو شے بیکار ہے، نظامِ حیات میں وہ کمیاب ہے، وہ نایاب ہے۔ ہوا اور پانی آپ کے لئے اس لئے بے قیمت ہو گئے کہ خالق نے زیادہ پیدا کر دیئے۔ اصل قیمت کا پتہ تو اس وقت چلے جب زندگی کے لئے ناگزیر چیز نایاب ہو۔ لق و دق صحرا ہو، ریگستان کا سفر ہو، جواہرات کا بڑا ذخیرہ پاس موجود ہو، پیاس کا غلبہ ہو، جب ایک مشکیزہ پانی کے بدلے جواہرات کا یہ ذخیرہ مانگا جائے تب میں سمجھوں گا کہ موتیوں کی قیمت زیادہ ہے یا پانی کی قیمت زیادہ ہے۔

تو اب جس نے جمادات کی خاطر جان دے دی، اس نے اپنے مرتبہ سے کتنا گر کر قربانی پیش کی۔ یعنی جوہر حیات انسانی کو پتھروں کی خاطر قربان کیا۔ تو جب پست پر اپنے کو قربان کیا تو یہ سنت کائنات کی مخالفت ہے۔ لہٰذا اس قربانی سے بلندی حاصل نہیں ہوگی۔

اور کس لئے دنیا قربانیاں پیش کرتی ہے؟ سلطنت کے لئے۔ سلطنت کیا ہے؟ سلطنت دنیا کے چند ملکوں میں ہے۔ باقی ملکوں میں سلطنت نہیں ہے۔ اب سلطنت کوئی نام سے نہیں ہوتی۔ جو چیز بھی اقتدار کا ذریعہ ہو، سلطنت نہ سہی، وزارت ہی سہی۔ ارے کوئی سا اقتدار جتنے دائرے میں ہو، چیئر مینی سہی، چیئر مین نہ سہی، ممبری ہی سہی۔ کتنے لوگ ہیں کہ جن کی عمر اس میں صرف ہوتی ہے؟ ہر دفعہ کھڑے ضرور ہوں گے۔ رہی کامیابی اور ناکامی تو ایک شاعر کا شعر یاد کر لیا ہے کہ:

مقدر سے ہے شکست و فتح نصیبوں سے ہے و لے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

تو گویا پیشہ ہو گیا ممبری کے لئے کھڑا ہونا۔ ضرور کھڑے ہوں گے۔ یہی ہوس بڑھ کر بادشاہت تک پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ امر اعتباری۔ امر اعتباری کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ بس ایک قرارداد ہو گئی ہے، لوگوں نے سمجھنا شروع کر دیا ہے تو بس ہو گئے۔ جب سے کچھ احباب نے سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ یہ ممبر ہے تو ممبر ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے مل کر کہا کہ یہ چیئر مین ہے تو چیئر مین ہو گیا۔ جب لوگوں نے مل کر کہا کہ یہ بادشاہ ہے تو بادشاہ ہو گیا۔۔ اس کا لوگوں کے ماننے،

سمجھنے اور تسلیم کرنے سے تعلق ہے۔ اپنے اندر کوئی بات نہیں ہوتی۔ جب سے لوگوں نے سمجھنا چھوڑ دیا، اس وقت سے ممبر نہیں رہا، چیئر مین نہیں رہا، بادشاہ نہیں رہا، وزیر نہیں رہا۔ بس آدمی رہ گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب عہدے جانے کے بعد آدمی رہ گیا، بشرطیکہ یہ سب عہدے ملنے کے بعد یہ آدمی رہا ہو اور اگر جب تک عہدہ نہیں ملا تھا، تب تک تو آدمی تھا اور ادھر عہدہ ملا اور آدمیت کو سلام رخصت کر دیا، اس لئے کہ عہدہ ہے۔ تو پھر جب عہدہ چلا گیا تو پھر نہ عہدہ رہا اور نہ یہ آدمی رہا۔

تو ان دنیاوی عہدوں کی حیثیت امر اعتباری کی ہے۔ جب امر اعتباری کی حیثیت ہے اور انسان نے اس کو مرکز قربانی بنایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جوہر حیات انسانی کو ایک عرض غیر حقیقی پر قربان کیا۔ ایک وصف پر، جو کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ امر اعتباری تھا۔

اور کس چیز کے لئے دنیا جان دیتی ہے؟ غور کیجئے، یہ وہ منزل ہے جہاں عرف عام میں محاورہ ہی قرار دے دیا ہے مرنے کا۔ اور شعراء حضرات نے قاتل اور مقتول کو بڑے بڑے انداز سے نظم فرمایا ہے۔ میری غیر شاعرانہ زبان یہ ہے کہ کسی جمال فانی کی خاطر جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ جب مرکز قربانی فانی ہے تو فانی سے کیا بقا ملے گی؟ یہ تو فنا در فنا ہوگی۔ بلندی تو جب ملے، جب فنا فی البقا ہو۔

لہٰذا یہ جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ درجہ میں انسان سے پست ہیں۔ اس لئے جب ان میں سے کسی کے لئے جان دے گا تو اس کا نام قرآن میں ہلاکت ہے۔ شہادت اس وقت ہوگی، جب بلند تر کی خاطر جان دے۔ ہاں! ایک قسم

جان دینے کی اور ہے اور یہ قسم وہ ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جان نہیں دی ،خدانخواستہ امتحان میں فیل ہوگئے، جان دے دی۔ تجارت میں دیوالیہ نکل گیا، جان دے دی۔ کسی اورطرح کے مقصد میں ناکام ہوئے ، جان دے دی۔ یہ جان دینا، اسے میں کیا عرض کروں؟ اس کارنامہ کے بارے میں جو میری سمجھ میں آتا ہے،وہ یہ ہے کہ اسے میدانِ حیات سے فرار کہتے ہیں۔اب آپ اگر دنیا کے فراروں کو قابل تعریف سمجھتے ہیں تو اسے بھی قابلِ تعریف سمجھ لیجئے۔

ہاں!ازروئے قرآں ایک فرار کو قابل تعریف جانتا ہوں اور قرآن نے بھی اس کی تعریف کی ہے اور وہ ہے معصیت الٰہی سے فرار۔ گناہ سے فرار۔ جو حضرت نے کیا تھا۔اس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:

فِرُّوْ اِلَی اللّٰہِ (الذاریات:50/51)

''بھاگو اللہ کی طرف''

یعنی دنیا کے جو معاصی کے سانپ ہیں، ان سے ڈر کر تم خدا کے ساتھ لو لگاؤ۔ بھاگو اللہ کی طرف۔ بس یہ ایک فرار ہے دنیا میں جو بے شک قابل تعریف ہے اور دنیا کے دوسرے کسی فرار کو آپ قابل تعریف نہیں سمجھتے ہیں تو اس فرار کو کیوں قابل تعریف سمجھیں گے؟ اس لئے کہ یہ شریعت میں بھی جرم اور قانون دنیاوی میں بھی جرم۔ دنیا کے متمدن قانون میں بھی جرم اور شریعت میں بھی گناہ اور گناہ اتنا عظیم کہ ہر گناہ سے توبہ ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ اس سے توبہ ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی بارگاہ میں حاضری ہی مجرمانہ ہوئی تو اس گناہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے! جو ناکامیاں ہوں، انہیں برداشت کرے۔

جو شدائد ہوں، انہیں سہے۔ بہادری کا تقاضا یہ ہے، جان دے دینا تو بزدلی ہے۔

تو یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قانون میں بھی جرم اور شریعت میں بھی گناہ۔ دنیا کے ہر متمدن قانون میں جرم تو ہے لیکن دنیا کی کوئی عدالت خودکشی کی سزا نہیں دے سکتی۔ یہ تو خودکشی کی ناکام کوشش کی سزا دیا کرتے ہیں اب جبکہ جرم کیا ہے اور سزا نہیں دی جا سکتی، اس لئے عقلی طور پر ضرورت ہے ایسی عدالت کے ماننے کی کہ جس جرم کی کوئی سزا نہ دے سکے، اس کی سزا وہ دے سکے۔ وہ خدائے حکیم کی عدالت ہے جو قیامت کے دن قائم ہوگی۔ جس طرح حیات میں اس کی سلطنت کی حدود سے نہیں نکل سکتا ،اسی طرح مر کر بھی اس کی حدود سلطنت سے نہیں نکل سکتا۔ اگر اس طرح جان دی تو وہ ایسی ہلاکت ہے جو تمام ہلاکتوں میں بدتر ہے۔ معلوم ہوا کہ جس چیز کی خاطر لوگ جان دیا کرتے ہیں وہ پست ہیں اور اگر خودکشی ہے تو بے مقصد ہے۔ وہ بھی پست ہے اور اس کا نام بھی ہلاکت ہے۔ شہادت اس وقت ہوگی جب بلند مقصد کی خاطر جان دے دی جائے اور اگر تجزیہ کیا جائے تو ہلاکت اور شہادت میں دو درجوں کا فرق ہے۔ دو درجے یوں ہیں کہ ریاضی کے اصول سے ہمیشہ ترقی اور تنزلی میں ایک درمیانی نقطے کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس نقطے سے نہ بڑھے اور اس سے گھٹے تو تنزلی۔ ایک تنزلی کا نقطہ ہوتا ہے۔ ایک درمیان کا نقطہ ہوتا ہے اور ایک اس کے اوپر ترقی کا نقطہ ہوتا ہے۔

اب یہاں ہلاکت اور شہادت کے بیچ میں ایک درجہ ہے، وہ ہے طبعی موت جسے آپ کہتے ہیں اپنی موت مرجاؤ۔ یعنی ارادے سے جان دی ہی نہیں، نہ بلند مقصد کی خاطر، نہ پست مقصد کی خاطر، بے مقصد۔ از خود جان ارادے سے نہیں دی۔ بیمار ہوئے، مرگئے۔ کسی حادثہ ارضی وسماوی کا شکار ہوگئے، مرگئے اور سب سے زیادہ اس دور کا رائج الوقت طریقہ کہ ایک دم ہارٹ فیل ہوگیا۔ اصل میں ڈاکٹر صاحبان معاف کریں۔ یہ ہارٹ فیل ہونا سبب موت نہ معلوم ہونے کا نام ہوا۔ ورنہ وہ وقت میں بھی مرے گا تو ہارٹ فیل ہوگا۔ تو یہاں ہارٹ فیل ہوگیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھے نہیں کہ کیا ہوا؟ کیوں مرگیا؟ بہر حال مرگیا۔

تو جب سمجھ میں نہ آئے کہ کیوں مرگیا تو اس کا نام ہے ہارٹ فیل۔ تو طبعی موت درمیان کا نقطہ ہے۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ نہ اس میں ترقی نہ تنزلی۔ نہ اس میں ثواب نہ عذاب۔ غلط فہمی نہ ہو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اعمال کا حساب یا ثواب نہیں۔ نہیں، اس مرنے کا نہ ثواب نہ عذاب۔ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیوں مرگئے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بڑا کام کیا کہ مرگئے۔ نہ مدح نہ مذمت نہ ہلاکت نہ شکر۔ یہ تو ہے درمیان کا نقطہ۔ اب اس کے ادھر ہے ہلاکت یعنی پست مقصد کی خاطر یا بلا مقصد جان دی۔ اس میں ہے عذاب اور دوسری طرف ہے شہادت یعنی بلند مقصد کی خاطر جان دی۔ اس میں ثواب ہے اور حیات ابدی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہلاکت اور شہادت میں جب اتنا فرق ہے تو جو شخص شہادت کے لئے جا رہا ہو، اس کے خلاف قرآن کی یہ آیت پیش نہ کی جائے:

"وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ" (البقرۃ 195/2)

"اپنے آپ کو خود سے ہلاکت میں نہ ڈالو"۔

یہ نہ کہے کہ علیؑ جانتے تھے کہ مسجد میں قاتل ہے تو کیوں گئے؟ حسینؑ جانتے تھے کہ کربلا میں یہ ہوگا تو کیوں آئے؟ جانتے تھے میدان میں تیر برس رہے ہیں تو بچے کیوں لائے؟ میں کہتا ہوں کہ قرآن نے ہلاکت کی طرف جانے سے منع کیا ہے، شہادت کی طرف جانے سے منع نہیں کیا۔ منزلِ شہادت کی طرف جانے والا خطرے کو محسوس کرتا ہے میں کہتا ہوں کہ اگر خطرہ محسوس نہیں کرتا تو قربانی کون سا کارنامہ ہے؟ وہ تو اتفاقی سانحہ ہے۔ خطرے کو محسوس کرتا ہے لیکن دیکھتا ہے کہ انحصار ہے کہ یا جان رہے یا مقصد رہے۔ تو مقصد کی خاطر مرضی الٰہی کی ترازو میں تول کر، جان کو اور مقصد کو، یہ دیکھ کر کہ مرضی الٰہی میں جان اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اہمیت یہ مقصد رکھتا ہے، تب وہ قدم اختیار سے منزلِ قربانی کی طرف جاتا ہے، پھر وہ کارنامہ ہو جاتا ہے۔ کارنامہ بھی زندۂ جاوید اور انسان بھی زندۂ جاوید۔

بس جناب! یہ اپنے اپنے مقصد کی اہمیت ہے اور اپنے اپنے دل کی ہمت ہے کہ کوئی اپنی جان دے سکے اور کوئی اپنی جان سے زیادہ عزیز افراد کو میدانِ قربانی میں لے آئے۔ اب یہ ایک وسیع موضوع ہے۔ دو طریقے ہیں نتیجہ نکالنے کے۔ ایک یہ کہ سبب کو دیکھو اور اثر کو سمجھو اور دوسرا یہ کہ اثر کو دیکھو اور سبب کو سمجھو۔ منطق میں یہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ دھواں دیکھا تو سمجھے کہ آگ لگی ہے اور معلوم ہوا کہ آگ لگی ہے تو سمجھے کہ دھواں بھی ضرور ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بہت ذہین افراد کا کام ہے کہ وہ مقصد حسینؑ کو سمجھیں۔ اپنے جیسے آدمیوں کے مقصد کو سمجھنا تو آسان نہیں ہوتا، چہ جائیکہ

اپنے سے بلند تر افراد کے مقاصد کو سمجھا جائے۔ بہت مشکل ہے کہ آدمی مقصدِ حسینی کو سمجھے اور پھر اس کی اہمیت پر غور کرے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان قربانیوں کو دیکھو کہ کیا پیش کی گئیں اور پھر غور کرو کہ کیا کسی معمولی مقصد کی خاطر ایسی قربانیاں پیش کی جاسکتی تھیں۔ یہ قربانیاں خود بتائیں گی کہ مقصد کتنا اہم ہے۔ کتنا عظیم ہے۔ علی اکبر کی جوانی ایسی نہ تھی کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر قربان کردی جائے۔ قاسم جیسے یتیم بھتیجے کی کم سنی ایسی نہ تھی کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر دے دی جائے۔ قربانیاں خود بتا رہی ہیں کہ مقصد اتنا عظیم تھا کہ اس کے لئے یہ سب قربانیاں گوارہ کرلی گئیں۔ اور اگر کربلا میں جنگ مغلوبہ ہوتی اور سب ایک ساتھ شہید ہو جاتے تو ہماری اشک فشانی کے لئے وہ سرمایہ بھی بہت بڑا تھا۔ عمر بھر رونے کے لئے وہ بھی کافی تھا لیکن ایک دم سے جنگ مغلوبہ میں سب شہید ہوتے تو جوہر اختیارِ صبر نمودار نہ ہوتا۔ وہ کربلا کی تدریجی رفتار مصائب ہے۔ اگر عزیز پہلے چلے جاتے اصحاب بعد میں رہتے تو دنیا سوچ سکتی تھی کہ جب علی اکبر جیسا بیٹا نہ رہا تو اب بیعت کرکے کیا کریں جب عباس جیسا بھائی نہ رہا تو اب بیعت کرکے کیا کریں مگر کربلا کی جو رفتار مصائب ہے کہ ہر مصیبت آتی ہے اور مولا کے دل پر وہ اثر ڈالتی ہے جو ایک مصیبت انسان کے دل پر ڈالتی ہے۔ اور پھر گویا سوال رہتا ہے کہ کیا اب بھی بیعت یزید نامنظور اور حسین کے آہنگ انکار میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اصل صبر یہ ہے۔ دنیا کہتی ہے رونا خلافِ صبر نہیں گر یہ خلافِ صبر نہیں ہے۔ نہ رونا صبر نہیں ہے۔ کردار پر یکساں طور سے باوجود مصائب قائم رہنا۔ اصل میں صبر یہ ہے۔ میں نہیں خلافِ شانِ امام سمجھتا۔ کسی شاعر نے کہا کہ علی اکبر کے غم میں روئے تو یہ خلافِ صبر نہیں۔ روئے بھی ہیں۔

بین بھی کئے ہیں۔ بے تابی بھی ہوئی ہے۔ جو اثر مصائب کے ہوتے ہیں وہ سب ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ رونا نہیں تھا۔ یہ مرثیے نہیں تھے۔ یہ بین نہیں تھے۔ یہ اس قربانی کی قیمت کا اظہار تھا اور اس مقصد کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا تھا کہ دیکھو میرا کیسا بھتیجا ہے کہ جسے میں نے مقصد کی خاطر دے دیا۔ دیکھو میرا کیسا بھائی ہے۔ انہی تاثرات سے ہم ان قربانیوں کے درجوں سے واقف ہوئے۔ جب حبیب ابن مظاہر گئے مولا کے چہرے پر شکستگی کے آثار تھے کہ ہم سمجھے کہ جس منزل پر حبیب تھے اس منزل پر کوئی دوسرا نہ تھا۔ اور ارباب عزا جب قاسم رخصت کے لئے مولا کے پاس آئے تو آپ کسی طرح اجازت نہیں دیتے تھے اور یہ نہیں کہ یہ فرمائیں ابھی نہیں ابھی نہیں بلکہ قطعی انکار۔ تمہیں کیونکر اجازت دوں تمہیں کیونکر اجازت دوں۔ اس طرح بچے کے لئے ایک معمہ بن گیا کہ رات کو تو اطلاع دے چکے تھے کہ تمہارا نام بھی دفتر شہدا میں ہے مگر اجازت تو دیتے ہی نہیں کروں کیا۔ بچے نے اتنا اصرار کیا اور مولا نے انکار کہ شہزادہ تھک کر عمود خیمہ کے ساتھ سر لگا کر سوچ میں پڑ گیا۔ اجازت نہیں مل رہی ہے یعنی کوئی مرنے سے کیا گھبراتا ہوگا جیسا یہ جینے سے گھبرا رہے ہیں ایک دفعہ یاد آیا کہ میری ماں نے بیان کیا تھا کہ میرے پدر بزرگوار نے دنیا سے جاتے وقت میرے بازو پر ایک تعویز باندھا تھا کہ جب سخت وقت پڑے تو اس کو کھول کر اس پر عمل کرے۔ بس اپنے دل سے پوچھا کیوں قاسم کیا اس سے بڑھ کر سخت وقت ہو سکتا ہے دل نے جواب دیا کہ اس سے بڑھ کر سخت وقت نہیں ہو سکتا۔ تعویز کو کھولا۔ اس میں لکھا تھا اے قاسم تم اس تعویز کو اس وقت کھولو گے جب تمہارا چچا نرغہ اعدا میں گرفتار ہوگا۔ اے قاسم اگر میں ہوتا تو میں اپنے بھائی کی نصرت کرتا۔ اب میں تو نہیں ہوں گا تم

کربلا میں میری طرف سے میرے بھائی کی مدد کرنا۔ اہلِ عزا تعویز جو پڑھا تو امام کے پاس آئے کہا کچھ نہیں بس وہ نوشتہ امام کے سامنے پیش کردیا۔ بس اربابِ عزا اب مولا کے دل کو سنبھالئے کہ ابھی تک بھیجنے کا حق نہیں تھا اب روکنے کا حق نہیں ہے۔ جناب شیخ مفید نے لکھا ہے کہ بھتیجے کو گلے لگا کر رخصت کے وقت اتنا روئے کہ غش آ گیا۔ میں اس رونے کیونکر انکار کروں کہ مولا روئے نہیں۔ یہ رونا تو اس مصیبت کی عظمت کا اظہار ہے۔ یہ اس قربانی کی اہمیت کا اظہار ہے اور جب قاسم نے صدا دی کہ چچا میں نے جاں نثار کی یا عماہ ادر کنی۔ اے چچا میری خبر لیجئے۔ تو جب حسین قاسم کی لاش پر گئے تو اس وقت بھی ایک مرثیہ پڑھا ہے وہ مرثیہ یہ ہے اے میرے بچے اے میرے بھتیجے تیرے چچا پر بڑا شاق ہے کہ تو پکارے اور وہ تیری مدد نہ کرے۔ یہ کیا ہے یہ اس قربانی کی اہمیت کا اظہار ہے۔ بس اربابِ عزا اسی پر ختم کروں گا کہ علی اکبر جب جانے لگے تو بڑی خصوصیتیں مولا نے برتیں ایک تو یہ کہ کسی کے جانے پر اللہ کو گواہ نہیں کیا مگر جب علی اکبر جانے لگے تو ہاتھ اٹھ گئے بارگاہ الٰہی میں۔ عرض کیا پروردگار تو گواہ رہنا کہ اب وہ جا رہا ہے ہاں اہلِ عزا امام کیا کیا کہہ سکتے تھے کون جا رہا ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ میری ضعیفی کا سہارا جا رہا ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ گھر بھر کی رونق جا رہی ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ ماں کے دل کی ڈھارس جا رہی ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ پھوپی کا اٹھارہ برس کا ریاض جا رہا ہے۔ ارے مختصراً کہہ سکتے تھے کہ میرا کڑیل جوان جا رہا ہے مگر مولا نے یہ نہیں کہا۔ کچھ نہیں کہا۔ کہتے ہیں وہ جا رہا ہے جو صورت اور سیرت رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے۔ اس مضمون کو جو میں نے ابھی بیان کیا مجھ سے بطور شعر نظم ہو گیا۔

شہ کو غم تھا شبیہ احمد کا     کب وہ روتے تھے اپنے اکبر کو

اللہ کو گواہ کیا اس کے بعد جب سب کو رخصت کرتے تھے تو بس رخصت کرتے تھے مگر علی اکبر جب چلے تو مولا اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکے دور تک علی اکبر کے گھوڑے کے پیچھے چلے گئے اور پکار کر فرماتے تھے کہ جب تک سامنا رہے مڑ مڑ کر دیکھتے رہو۔ ہاں ارباب عزا آخری خصوصیت کہ ادھر علی اکبر نے صدا دی تو جس کی لاش پر گئے سیدھے چلے گئے۔ عباس جیسا شیر جدا ہوا کمر تھام لی کہا میری کمر ٹوٹ گئی مگر پھر تلوار لے کر فوج پر حملہ کر دیا اور وہ فوج جو عباس جیسے شیر کو مار چکی گویا قتل کر چکی وہ حسین کی تلوار کے سامنے سے بھاگی۔ تو حملہ ہے طبری میں۔ جو میں سمجھتا ہوں ایک مرثیہ ہے امام فرماتے ہیں این تفرو فقد قتلتم الاخی۔ ارے بھاگتے کہاں ہو میرے بھائی کو تو مار دیا تو عباس کا داغ اٹھانے کے بعد کمر شکستہ ہوگئی مگر عالم یہ ہے کہ فوج پر حملہ کر دیا مگر علی اکبر کی آواز جب آئی تو یہ عالم ہے کہ کبھی داہنی طرف جاتے ہیں کبھی بائیں طرف جاتے ہیں کہتے ہیں یا علی یا علی مطلب کیا ہے اس یا علی کا کوئی عالم کہتا ہے کہ علی اکبر ہی کو آواز دے رہے ہیں کیونکہ ان کا نام علی تھا مطلب یہ کہ بیٹا اب نگاہ کام نہیں کرتی ایک دفعہ اور صدا دے لو تو تمہاری آواز پر آجائیں کوئی عالم کہتا ہے کہ باپ کو پکار رہے تھے کہ اے بابا آپ مشکل کشا ہیں۔ یہ آپ کے بیٹے پر سخت وقت پڑا ہے آپ ہی سہارا دیں۔

# فلسفۂ شہادت

## تیسری تقریر

- پست مقاصد کے لئے جان دینا ''ہلاکت'' اور بلند تر مقاصد کے لئے جان دینا ''شہادت'' ہے۔
- ''شرک'' نتیجہ ہے انسان ناشناسی کا۔
- خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔
- ''آفاق'' اور ''نفس'' میں خدا کی نشانیاں۔
- عقل کی اہمیت اور غیب پر ایمان۔
- ''جاننے اور پہچاننے'' کا فرق۔ کائنات خدا کو جاننے کا ذریعہ جبکہ نفس خدا کو پہچاننے کا ذریعہ ہے۔
- لامکان اور حاضرو ناظر ہونے کو نفس کے ذریعے سمجھنا۔
- ''وجہ اللہ'' کون؟
- حیات النبی پر تبصرہ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ (آل عمران 169/3)

ارشادِ الٰہی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی بارگاہ میں رزق پاتے ہیں۔

انسان اگر پست مقاصد کے لئے جان دے گا تو یہ سنتِ کائنات کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا اس کا نام ہلاکت ہوگا۔ اُسے شہادت نہیں کہیں گے۔ شہادت اسی وقت ہے جب بلند تر مقاصد کے لئے جان دی جائے اور انسان سے بلند عالم کائنات میں کوئی نہیں ہے۔ مگر یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ دنیا انسان کو نہیں سمجھی کہ انسان کیا ہے، حقیقت میں شرک کی جتنی اقسام ہیں، سب انسان کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ یعنی دنیا کی باتیں انسان نے سمجھ لیں لیکن اپنے آپ کو نہ سمجھ سکا۔ اگر یہ سمجھتا کہ انسان کیا ہے تو پتھروں کے سامنے کیوں جھکتا؟ اگر یہ سمجھتا کہ انسان کیا ہے تو نباتات کے سامنے کیوں جھکتا؟ اگر یہ سمجھتا کہ انسان کیا ہے تو حیوانات کے سامنے نہ جھکتا۔ اور حقیقت میں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنے کا مطلب انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے، یہ نام کو انسان کے سامنے جھکتا ہے لیکن دراصل اُس دولت کے سامنے جھکتا ہے جو دوسرے انسان کے پاس ہے۔ اس شہرت کے سامنے جھکتا ہے جو دوسرے انسان کو حاصل ہے۔ اس عہدہ ومنصب کے سامنے جھکتا ہے جو دوسرے انسان کے پاس ہے۔ یہ سب چیزیں انسان سے پست

ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان چیزوں کی وجہ سے کسی کی عزت کی تو یہ دولت کو اپنے سے زیادہ معزز سمجھا۔ یعنی پتھروں سے خود کو نیچا سمجھا۔ اُس نے سلطنت کو اپنے سے اونچا سمجھا۔ تو حقیقت میں یہ جو شرک کی سب اقسام ہیں، وہ انسان ناشناسی کی وجہ سے ہیں۔ اگر انسان اپنے آپ کو سمجھتا تو اپنے سے بالاتر کے آگے جھکتا اور اپنے سے بالا اس کو خالق کے سوا کوئی اور نہ ملتا۔ تو چاہے نام نہ لے سکتا مگر مانتا اسی کو۔ کہتا کہ میں بس اسی کو مانتا ہوں جو سب سے اونچا ہے، اسی کو مانتا ہوں جو سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ جتنا سمجھتا، اپنے الفاظ میں کہہ دیتا۔

یاد رکھئے کہ حقیقت الفاظ سے وابستہ نہیں ہے۔ مگر اس نے سمجھا ہی نہیں کہ میں کیا ہوں؟ تو نتیجہ یہ ہے کہ ہر چیز کے سامنے جھکنے لگا۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَہُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہُ" (بحار الانوار: جلد۲، باب۹)

"جس نے اپنے آپ کو پہچانا، وہ اپنے پروردگار کو بھی پہچان لے گا"۔

اس کے بہت سے رخ ہیں، بہت سے پہلو ہیں۔ کلامِ رسولؐ کی جامعیت یہ تھی کہ الفاظ مختصر ہوتے تھے لیکن ان کے دامن میں معنی کا سمندر ہوتا تھا۔ کوزہ میں سمندر سمایا ہوا ہوتا تھا۔ اس وقت جو مفہوم میرے بیان سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر سمجھ لے کہ میں کون ہوں تو یہ سمجھ لے گا کہ میرا مالک کون ہونا چاہئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں دیکھئے کہ اس نے جو اپنے وجود کی نشانیوں کا پتہ دیا تو ارشاد کیا کہ:

سَنُرِیْهِمْ آیَاتِنَا فِی الْآفَاقِ وَفِیْ
اَنْفُسِهِمْ" (فصلت:53/41)

"ہم اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے نفوس میں دکھاتے ہیں"

یعنی ایک پلڑے میں تمام آفاق جس میں آسمان ، زمین ، چاند، سورج، ستارے، ثوابت وسیارے سب شامل ہیں اور ایک پلڑے میں انسان تو معلوم ہوتا ہے کہ جو مقصد پوری کائنات سے پورا ہوتا ہے، وہ انسان کے لئے (خداشناسی کی منزل میں) انسان سے پورا ہوتا ہے۔

دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، وہ حواس سے متعلق ہیں، مثلاً سورج چمک رہا ہے، اس کا تعلق آنکھ سے ہے۔ نغمے خوش آئند ہیں، اس کا تعلق کان سے ہے۔ پھول کی خوشبو بھینی بھینی ہے، اس کا تعلق مشام سے ہے۔ غرض جتنی آیاتِ الٰہی آفاق میں ہیں، ان سب کا تعلق احساسات سے ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص کال کوٹھری میں پیدا ہوا اور اسی میں عمر بھر رہا تو اگر اللہ کی نشانیاں آفاق ہی میں مضمر ہوتیں تو اس پر حجت خدا تمام نہ ہوتی۔ سورج اور چاند اگر خدا کی نشانیاں ہیں تو اسے تو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اگر پھولوں کی خوشبو میں اس کی قدرت کے نمونے ہیں تو نہ پھول اس کو نظر آئے نہ ان کی خوشبو سونگھنے کا موقع ملا۔ اس طرح اس کے تمام حواس میں سے کسی کو کام کرنے کا موقع ملا ہی نہیں۔ لہٰذا حجتِ خدا اس پر تمام نہیں ہوتی، اس لئے ضرورت تھی کہ خدا کی ایک ایسی دلیل ہو جس کے لئے نہ دیکھنے کی ضرورت، نہ کانوں سے سننے کی ضرورت، نہ ہاتھ سے چھونے کی ضرورت۔ اور وہ انسان کا خود اپنا وجود ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو کیا آئینے میں دیکھ کر جانا کہ میں ہوں؟ کیا اپنی

آواز کو سن کر سمجھا کہ میں ہوں؟ کیا اپنے آپ کو چھو کر سمجھا کہ میں ہوں؟ آپ نے اپنے کو احساسات سے نہیں سمجھا ہے بلکہ وجود نے اپنی پہچان کروائی ہے۔ اس کے لئے الگ سے کسی اور احساس کی ضرورت نہیں تھی۔

اب جس وقت نہ آنکھوں کو دیکھنے کا موقع ملے، نہ کانوں کو سننے کا موقع ملے، تمام آیات الٰہی اس سے پردے میں ہیں لیکن سب سے بڑی آیت جو خود اس کا نفس ہے، وہ تو اس کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اس کے لئے بھی حجتِ خدا تمام ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری ہدایت نہیں ہوئی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس اندر والی رہنمائی کا تعارف صرف اُدھر والے رہنماؤں نے کروایا ہے ورنہ دنیا، جس نے عقل اور ضمیر کو سمجھا ہی نہیں، جس نے دین سے عقل کو بے دخل کر دیا، وہ اس باطنی رہنما کی قدر کیا جانیں؟ یہ اُدھر والے رہنما ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ:

**"اَلرَّسُوْلُ عَقْلٌ مِنْ ظَاهِرٍ وَالْعَقْلُ مِنْ بَاطِنٍ"** (الکافی: کتاب العقل والجهل تھوڑے سے فرق کے ساتھ)

"رسول جو ہوتا ہے، وہ عقل ہے جو سامنے دکھائی دیتا ہے اور عقل وہ رسول ہے جو اندر سے رہنمائی کرتی ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا خلاصہ میں اپنے الفاظ میں یوں کرتا ہوں کہ رہنما اگر سامنے آجائے تو رسول یا امام ہے اور پردہ میں چلا جائے تو عقل ہے۔

اسی لئے جو ہماری سب سے بڑی کتاب ہے، اس کا نام کافی ہے۔ اس کا پہلا باب عقل و جہل ہے۔ اس لئے کہ جو دین کی پہلی منزل ہے یعنی اللہ،

اسکواس وقت تک نہیں پہچانا جاسکتا جب تک عقل کو بروئے کار نہ لایا جائے، اس لئے کہ آنکھوں سے نہیں دکھائی دیتا، غیب الغیوب ہستی۔ اور یہی بات ہے جو دین سے عقل کو بے دخل کردیں گے، وہ کبھی غیب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ غیب کا تعلق مشاہدات سے ہے اور غیب پر وہی ایمان لائیں گے جو عقل کی رہنمائی کے قائل ہوں گے اور اللہ کی معرفت انہی کو ہوسکتی ہے جو غیب پر ایمان لانے کے لئے تیار ہوں کیونکہ اگر غیب پر ایمان نہیں لائے تو وہ اس ذات کو کیا سمجھے گا جو مکمل غیب ہے۔ یعنی کوئی غیب وہ ہوگا جس کو ہماری آنکھوں نے نہ دیکھا ہو لیکن ہمارے بزرگوں نے دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ آدم سے لے کر خاتم تک کسی نے نہیں کہا کہ میں نے اُسے دیکھا ہے۔ کسی کو آنکھ سے نہ دیکھیں، خواب میں دیکھیں۔ لیکن یہ وہ ذات ہے جو خواب میں بھی کبھی نہیں دکھائی دیتی۔ میں کہتا ہوں کہ خواب بھی میں دکھائی نہیں دے سکتا۔ ایک اصولِ عقلی یہ ہے کہ خواب میں وہی چیز دیکھی جاسکتی ہے جو بیداری میں دیکھی جاسکے۔ خوشبو خواب میں بھی سونگھی جائے گی، دیکھی نہیں جائے گی۔ نغمہ خواب میں بھی سنا جائے گا، دیکھا نہیں جائے گا۔ جو چیز چھونے سے متعلق ہے، وہ خواب میں بھی چھونے سے سمجھ میں آئے گی۔ تو نوعیتِ احساس خواب میں نہیں بدلتی۔ خواب میں بھی دیکھنے کی چیز دیکھی جاتی ہے، سننے کی چیز سنی جاتی ہے۔ جو ذات بیداری میں نہ دیکھنے کے قابل ہو، نہ سننے کے قابل ہو، نہ چکھنے کے قابل ہو، نہ چھونے کے قابل ہو، وہ خواب میں احساسات کی اسیر کیونکر ہوگی؟! اگر خواب میں کسی نے دیکھا ہے تو وہ نہیں ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے علاقے میں پیدا ہونے والے نبی کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ میں نے

اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ فرماتے ہیں کہ جب میں نے خواب میں دیکھا تو قلم بڑھا دیا کہ سند دے دیجئے، ثبوت کا پروانہ دے دیجئے۔ خیر اس وقت قلم دوات دے دیا اپنے مطلب کے لئے۔ اُس کا مطلب ہوتا تو نہ دیتے۔

خیر! قلم دوات دے دیئے۔ اس نے شکریہ ادا کیا۔ اس زمانہ میں فاؤنٹین پین تو ہوتا نہیں تھا، قلم سیاہی میں ڈبو دیا۔ روشنائی نب میں زیادہ آ گئی، اُسے قلم کی زبان کہا کرتے تھے تو زبانِ قلم میں سیاہی زیادہ ہو گئی۔ انہوں نے قلم جھٹک دیا تو اتنی تمیز داری سے جھٹکا کہ چھینٹے اُن کے کرتے پر آ کر گرے۔ الفاظ میرے ہیں، مطلب ان کا ہے۔ تو چھینٹے ان کے دامن پر پڑے۔ ان کی قمیص پر پڑے۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ پروانہ تو کوئی نہ تھا، دامن پر داغ موجود تھا۔ ہر سال ایک دن مقرر تھا جب اس کی زیارت کروائی جاتی تھی۔ بعض صوفیاء اور مشائخ کے ہاں بھی موجود ہے کہ میں نے ستر مرتبہ خدا کی زیارت کی لیکن میں کسی طرح اس کو ممکن نہیں سمجھتا۔ وہ ذات ایسی غیب الغیوب لیکن اس کو جب تک نہ مانیں، اس وقت تک دین کی ابتدائی سطر بھی طے نہیں ہوتی۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

**"اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعرِفَتُہٗ"** (نہج البلاغہ۔خطبہ ۱)

"دین کی پہلی منزل اس کو سمجھنا ہے"۔

غیب کا اگر کوئی منکر ہو تو اس کو نہ مانے گا۔ جتنی منزلیں اس کے بعد دین کی ہیں، چلئے جو سب کے نزدیک مسلّم ہیں، توحید کے بعد رسالت۔ میں کہتا ہوں کہ نبوت کو کیا آنکھوں سے دیکھ کر مانا ہے؟ کوئی کہے گا کہ ہم

نے نہ کہی ، جو حضرات تھے اس وقت موجود، انہوں نے دیکھ کر مانا ہے؟ میں نے کہا جو حضرات اس وقت تھے اور جنہوں نے مانا کیا انہوں نے بھی نبوت کو دیکھا؟ روئے مبارک سامنے تھا، زلف مبارک سامنے تھی، دندانِ مبارک سامنے تھے۔ یہ سب چیزیں سامنے تھیں مگر رسالت سامنے نہیں تھی۔ نبوت سامنے نہ تھی۔

اور یاد رکھئے ذکر رسول یوں تو ہر طرح عبادت ہے مگر ایمان جو لانا ہے، وہ گیسوئے مبارک پر نہیں ہے، روئے مبارک پر نہیں ہے، دندان مبارک پر نہیں ہے، ایمان لانا ہے رسالت پر اور رسالت کے معنی بھیجا ہوا ہونا۔

تو جب بھیجنے والے کو نہیں دیکھا تو بھیجنا کہاں دیکھا؟ پھر جبرئیل امین کو نہیں دیکھا جو وحی لائے۔ ان کو قرآن سناتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ سب باتیں رسول کی زبان کے اعتبار پر مانیں۔ انہوں نے کہا کہ جبرئیل آتے ہیں، اس لئے مانا۔ انہوں نے کہا کہ وحی اُترتی ہے، اس لئے مانا۔ آنکھوں سے دیکھ کر منوانا ہوتا تو چالیس برس کے انتظار کی ضرورت نہ تھی۔ یہ چالیس برس کے انتظار کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ پہلے زبان کا اعتبار قائم کر دیا جائے تاکہ پھر جب غیب کی خبریں دوں تو دنیا ماننے کے لئے تیار ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ رسالت جس کا نام ہے وہ بھی بغیر دیکھے مانی۔

اس کے بعد مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ تیسری چیز قیامت ہے۔ تو قیامت کو کیا آنکھوں سے دیکھ کر مانا؟ اگر آنکھوں سے دیکھ لیتے تو قیامت ہو ہی نہ جاتی۔ قیامت کو بھی بغیر دیکھے مانا اور قیامت کو ماننے کے ساتھ کیا کیا مانا؟ ایک پورے کارخانۂ قدرت کو مانا۔ صراط مانا، میزان مانا، نامۂ اعمال کو مانا

اور سب سے زیادہ دل پسند چیز بہشت کو مانا اور سب سے زیادہ خوفناک چیز دوزخ کو مانا۔ یہ سب بغیر دیکھے ہوئے مانا۔ تو میں تو بڑے دردمندانہ طور پر مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اتنی باتیں جس کے کہنے سے مان کر مسلمان ہوئے، اب ایک کو نہ مان کر اپنے ایمان کو کیوں خطرے میں ڈالتے ہو؟ غیب کے ماننے کا ذریعہ صرف عقل ہے اور عقل کو اگر کوئی نہ مانے تو غیب کو ماننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دین میں اگر عقل کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو جس کو اس نے عقل نہیں دی، اس کو تکلیفِ شرعی سے بری کیوں کر دیتا؟ دیوانے پر حرام فعل کا گناہ، نہ اس کے لئے آخرت کی سزائیں۔ بتایئے کیوں بری کر دیا، اس لئے کہ عقل نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ دین کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

اس لئے جو باہر سے حقیقت میں عقل تھے، انہوں نے ارشاد فرمایا:

"لاَ دِیْنَ لِمَنْ لاَ عَقْلَ لَهٗ" (نہج الفصاحہ۔ کلمات قصار نمبر ۱۰۹۵)

"اس کے لئے دین نہیں ہے جس کے پاس عقل نہیں ہے"۔

کافی میں ایک حدیث ہے، بطور تمثیل بیان کیا ہے کہ ایک عابد ایک جزیرہ میں رہتا تھا۔ جزیرہ بہت سرسبز و شاداب تھا۔ دن رات عبادت کرتا تھا۔ ایک فرشتے کا اُدھر سے گزر ہوا۔ فرشتے نے جب اس کی عبادت کو دیکھا تو اس کو بہت بڑی چیز سمجھا کہ دن رات عبادت کرتا ہے۔ اسے اشتیاق ہوا کہ اس کے ثواب کو میں دیکھوں کہ اسے کتنا ثواب ملے گا۔ خالق سے دعا کی، دعا مستجاب ہوئی اور اس عابد کا ثواب فرشتے کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ فرشتے نے اس کے عمل کی کثرت کا توازن کیا اور اس ثواب

کو اُس کے لئے کم سمجھا۔ یہ اتنی عبادت کرتا ہے اور اسے اِتنا ثواب ملے گا؟ اس نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی: پروردگار! (ملائکہ عالم قدس کے طالب علم ہیں، طالب علم کی سمجھ میں جو کچھ نہ آئے، اُسے استاد سے پوچھنے کا حق ہے) تو اُس نے عرض کی کہ پروردگار! اس کی عبادت تو اتنی عظیم ہے اور اس کا ثواب اتنا کم؟ آخر یہ کیا راز ہے؟

تو ارشادِ قدرت ہوا کہ تھوڑے دن اس کے پاس رہو، تمہیں اس کا راز معلوم ہو جائے گا۔ وہ فرشتہ بصورتِ انسان اس کے پاس گیا اور اس کے پاس مصلیٰ بچھا دیا۔ اس عابد کو برا معلوم ہوا کہ میری عبادت میں خلل اندازی ہوگی۔ اُس نے جب ان کی شانِ عبادت دیکھی، جب استغراق دیکھا تو جانا کہ یہ مجھ سے بالاتر عبادت کرتے ہیں۔ انہیں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اپنا رفیق سمجھنے لگے کہ یہ عبادتِ خدا میں میرا معاون ہے، مددگار ہے۔ مجھے اپنے سے شوق دلاتا ہے۔ جب مانوس ہوگیا تو گفتگو شروع کی کہ تمہارے لئے یہ عبادت کا کتنا موزوں مقام ہے۔ اس کی سرسبزی وشادابی کی انہوں نے تعریف کی۔

ہمارے یہاں یہ روایت ہے کہ بعض جانوروں کے نام کو غیر شائستہ سمجھتے ہیں حالانکہ جانور سب مخلوقِ الٰہی ہیں۔ انہوں نے کہا: بے شک، بہت اچھا مقام ہے مگر یہاں ایک خرابی ہے کہ اتنی گھاس اور سبزہ بے وجہ برباد ہو رہا ہے۔ ہمارے خدا کے پاس اتنے درخت ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جانور ایسا نہیں ہے جو اس کو چر جائے۔ انہوں نے سن لیا۔ وہاں تو لاسلکی ہے۔ بات چیت کے لئے توقف کی ضرورت نہیں۔ اُدھر سے خطاب ہوا کہ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اس عبادت کا ثواب کیوں کم ہے؟

اب جس اصول کے لئے یہ واقعہ پیش کیا گیا کہ میں بقدرِ عقل ثواب دیتا ہوں۔ بس ایک اصول قائم ہوگیا۔ یہ بقدرِ عقل کیا؟ عقل اصل میں سرمایۂ معرفت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت بے معرفت کتنی زیادہ ہو لیکن اس میں وہ قدر و قیمت نہیں جتنی عبادتِ با معرفت میں ہے۔ یعنی مقدارِ عبادت دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، مقدارِ عبادت معیار نہیں ہے بلکہ وہ محرکاتِ عبادت جو ذہن میں پس منظر ہے عبادت کا، وہ عبادت میں وزن پیدا کرتا ہے۔ اب کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے اگر رسول ایک پلڑے میں تول کر عبادتِ ثقلین کو رکھ دیں اور ایک پلڑے میں ایک ضربت کو۔

تو جو سلسلہ کلام تھا کہ ایک پلڑے میں تمام آفاق اور ایک پلڑے میں صرف انسان کا نفس، اسی طرح ایک پلڑے میں ان کی ضربت اور ایک پلڑے میں ثقلین کی عبادت۔ ویسے ہی ایک پلڑے میں تمام کائنات اور ایک پلڑے میں انسان کا نفس۔ یعنی جس کے لئے تمام کائنات دلیلِ معرفت بننے سے قاصر ہو، اس کے لئے یہ نفس انسانی دلیلِ معرفت بنتا ہے۔ وہ ان سب کی جانشینی کرتا ہے، ان سب کی قائم مقامی کرتا ہے۔

اب ایک دوسرا پہلو عرض کرتا ہوں اور وہ پہلو یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے جاننا اور ایک ہوتا ہے پہچاننا۔ میری کتابیں آپ نے دیکھی ہوں گی، مگر اتفاق سے آپ نے کبھی میری تصویر نہیں دیکھی، نہ مجھے دیکھا تو اگر کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ فلاں شخص کو آپ جانتے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ جی ہاں، جانتا ہوں۔ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے، یہ کتاب پڑھی ہے۔ اگر پوچھا جائے

کہ آپ پہچانتے ہیں تو فرمائیں گے کہ نہیں، مجھے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ میں نے کبھی کوئی تصویر دیکھی ہے۔ لیکن اگر مجھے دیکھا ہے یا میری کوئی تصویر کبھی دیکھی ہے، اب پوچھا جائے کہ جانتے ہیں؟ جی ہاں۔ پھر تصانیف کا نام لیں گے۔ پہچانتے بھی ہیں؟ ہاں ہاں، میں نے ٹی وی پر تصویر دیکھی تھی ۔فلاں جگہ مجلس پڑھتے دیکھا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ جاننا اور ہوتا ہے جبکہ پہچاننا اور ہوتا ہے۔ کائنات میں نفس انسانی کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ جاننے کا ذریعہ ہیں۔ جس طرح نقش نقاش کو بتاتا ہے، جس طرح تصویر مصور کو بتاتی ہے، جس طرح تصنیف مصنف کو بتاتی ہے، اسی طرح کائنات کی ہر چیز خدا کو جاننے کا ذریعہ لیکن انسان اپنے جسم کے ساتھ تو جاننے کا ذریعہ مگر اپنے نفس کے ساتھ یہ اس کے پہچاننے کا بھی ذریعہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اُس نے عالم امکان میں اپنی بہت سی صفات کی اس کو جلوہ گاہ بنایا ہے۔ مثلاً آپ سے میں پوچھوں کہ آپ کے اس جسم میں نفس ہے؟ آپ کہیں گے، یقیناً۔ میں آپ کا ہاتھ اٹھا کر کہوں کہ اس میں ہے؟ آپ کہیں گے، نہیں۔ یعنی خالی ہاتھ ہیں۔ آپ سے کہوں پیر میں ہے؟ آپ کہیں گے، نہیں۔ اور اسی طرح جتنے اجزائے جسم ہیں، ایک ایک حصہ پر ہاتھ رکھ کر میں کہوں، یہاں ہے؟ آپ کہیں گے نہیں۔ اچھا تو وہ پورے جسم میں تقسیم ہے یعنی تھوڑا ہاتھ میں ہے، تھوڑا پیر میں ہے، تھوڑا آنکھوں میں ہے، تھوڑا سر میں ہے، پورے جسم میں تقسیم ہے یعنی ہاتھ کٹ گیا تو اتنا حصہ اس کا کم ہوگیا۔ اگر پیٹ کٹ گیا تو ایک حصہ اس کا کم ہوگیا۔ کہیں گے نہیں۔ تقسیم بھی نہیں۔ تو اسی جسم میں ہے اور آپ

نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ہے، نہ پورے جسم میں بتا سکتے ہیں کہ تقسیم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ امکانی دائرہ میں لامکان ہونے کا نقشہ ہے۔ یونہی آپ اس ممکن نمونہ سے واجب نمونہ کو سمجھ لیجئے کہ وہ حجاز میں ہے، عراق میں نہیں ہے۔ مشرق میں ہے، مغرب میں نہیں ہے۔ وہ دائیں طرف ہے، بائیں طرف نہیں ہے۔ تو وہ غلط۔ یہ کہئے کہ وہ سب میں تقسیم ہے، کچھ وہاں ہے، کچھ وہاں ہے، کچھ وہاں ہے، وہ بھی غلط۔ تو آپ نے دیکھا کہ یہ عالم امکان میں وجوب لامکانی کا نقشہ کھنچ گیا۔

راستہ چلتے میں سر میں ٹکر لگی۔ دروازہ نیچا تھا، فوراً آپ کو خبر ہوئی۔ سیتے ہوئے سوئی انگلی میں چبھی، اُسے خبر ہوئی۔ پیر میں ٹھوکر لگی یا کانٹا چبھا، فوراً اُسے خبر ملی۔ کیا کوئی مخبر گیا جس نے اطلاع دی ہو۔ اچھا کہیں جلدی خبر ہوئی ہو، کہیں دیر میں۔ میں کہتا ہوں کہ عالم امکان میں یہ حاضر وناظر ہونے کا نقشہ ہے۔

جس طرح تمہارے نفس کو تعلق ہے، تمہارے چھوٹے سے جسم سے، ویسے ہی خالق کا تعلق تمام کائنات سے ہے۔ لہٰذا اُسے مغرب کی بھی خبر، مشرق کی بھی خبر۔ تہہ زمین کی بھی خبر، بالائے آسمان کی بھی خبر۔ کائنات میں جتنے اجزاء ہیں انہیں جا کر خبر کرنے کی ضرورت نہیں۔ رپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمام کائنات پر اس کا علم محیط ہے۔

"وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا" (طٰہٰ 20/98)

"ہر شے پر اس کا علم محیط ہے"

آپ کے جسم کے اندر اس کا نمونہ پیش کر دیا۔ اِسے دنیا سمجھ لیتی ہے، اُسے نہیں سمجھتی۔ یہ دنیا کی ستم ظریفی ہے کیونکہ نفس انسانی کو امکانی حد تک اپنی صفات کی جلوہ گاہ بنایا، اس لئے کائنات جاننے کا ذریعہ اور نفس پہچاننے کا ذریعہ۔ فرق کو محسوس کیجئے۔ وہ عطا کرنے والا ہے، اس سے فیض حاصل کرنا پڑتا ہے۔ وہ بذاتِ خود کامل ہے، یہ اس کے کامل بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی درجہ ہوگا کہ نفس بس آپ کا نفس رہے اور کوئی مرتبہ کمال اسی نفس انسانی اور انسان کا ہوگا کہ وہ اپنا نفس کہہ دے۔

انسان اگر انسان کی منزل سمجھ لے تو پھر خدا کو سمجھ لے گا۔ اور اس کو یوں کہا جائے کہ جتنا اپنے کو سمجھے گا، اُتنا خدا کو سمجھے گا اور جتنا اپنے نفس کو سمجھے گا، اتنا خدا کو سمجھے گا۔ تو وہ بلند تر نفوس جن کو اس نے اپنا نفس قرار دیا ہے، اس کی معرفت ان کی معرفت کے بغیر کیونکر ہوگی؟ اسی لئے انداز مختلف ہے، الفاظ مختلف ہیں۔ کسی اعتبار سے نفس کہہ دیا، کسی اعتبار سے وجہہ یعنی چہرہ کہہ دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ چہرہ پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے، کوئی چادر اوڑھے ہوئے ہوں، صرف ہاتھ باہر ہوں تو شاید نہ پہچان سکیں۔ پیر باہر ہوں تو شاید نہ پہچانیں۔ لیکن اگر چہرہ باہر ہے تو فوراً پہچانیں گے کہ کون ہے؟ تو چہرہ پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تو اس لئے ان حضرات کو بھی وجہ اللہ کہہ دیا گیا کہ یہ اللہ کا چہرہ ہیں اور ارشاد ہوا:

"كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ" (القصص 88/28)

"ہر شے ہلاک ہونی ہے، فانی ہے سوائے اُس کے چہرے کے"۔

تو اب دنیا والوں نے چہرے کے معنی وہی سمجھے۔ جب قرآن کو لغت سے حل کیا جائے تو یہی ہوگا۔ لغت میں جو معنی سمجھے تو سمجھ لیا کہ یہ چہرہ ہے۔ اور جب چہرہ ہے تو ہاتھ بھی ہیں، پیر بھی ہیں، سب کچھ ہے۔ اب کیا ہوا؟ زیر سایۂ اسلام جو تصور آیا ہے، قرآن کو کافی سمجھنے کا نتیجہ، قرنِ اوّل کا تصور، کسی امام کے سامنے، معصوم کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی کہ سوائے اس کے چہرے کے ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ امام سے معنی پوچھے۔ امام نے فرمایا: لوگ کیا معنی سمجھتے ہیں؟ لوگ سے مراد اس زمانہ کے علماء تھے۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ وہ تو ایسی باتیں کرتے ہیں، میری ہمت نہیں ہوتی کہ آپ کے سامنے نقل کرسکوں۔ آپ نے جب کہا کہ بتاؤ۔ اس پر صحابی یہ کہنے لگے کہ وہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ قیامت مدتِ دراز کے بعد آئے گی اور اتنا زمانہ گزر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ازلی سرمدی، جس کی ابتداء کو ہم نہیں جانتے، جان ہی نہیں سکتے۔ تو امتدادِ زمانہ سے بس اللہ کا چہرہ ہی رہ جائے گا۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ ایک صاحب اپنے مقتداء کی فضیلت میں بیان کر رہے تھے کہ کھڑے ہوکر جو عبادت شروع کی تو دن رات میں کبھی بھی نقل و حرکت نہیں کرتے تھے۔ برسوں گزر گئے، یہاں تک کہ سینے سے اوپر تک دیمک نے کھالیا۔ جب فضیلتیں بنائی جاتی ہیں تو ان میں ایسی ہی بدسلیقگی ہوتی ہے۔ یہ میں نے خود ایک عقیدت مند کی زبان سے سنا۔ اس بزرگ کا نام تو یاد نہیں رہا جو دیمک کے کھائے ہوئے تھے۔ یہ مشرکانہ تصور تھا۔ آپ نے ابھی دیکھا کہ قرآن کو کافی سمجھنے کا نتیجہ۔ دیمک نہ سہی، کسی طرح گھس کر سب ختم ہوجائے گا اور صرف چہرہ باقی رہ جائے گا۔ بالکل لفظی معنی کے مطابق ہے:

"کُلُّ شَیۡءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجۡھَہٗ" (القصص 88/28)

"ہر شے ہلاک ہونی ہے، فانی ہے سوائے اُس کے چہرے کے"۔

سب ختم ہو جائے گا سوائے چہرے کے۔ اور چہرہ ٹھہرا ہوا کس پر ہے؟ اس کا تعلق عقل سے ہے اور عقل سے کام لیتا نہیں ہے۔ یعنی سوائے قرآن کے سب چیزوں کے چھوڑنے کا جو شوق ہوا، اس میں بے چاری عقل بھی گئی۔ قرآن کافی ہے، لہٰذا عقل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن نے ہر جگہ اپنا مفہوم سمجھنے کے لئے کہا کہ صاحبانِ عقل سمجھیں گے۔ تو جب عقل سے کام نہ لیا جائے گا تو جس کا دامن تھاما تھا، وہی دامن چھڑوا کر چلا جائے گا کیونکہ خود کہہ چکا کہ یہ قرآن ان کے لئے ہے جو عقل سے کام لیں۔ اس کو شکایت یہی ہے کہ:

"اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُھَا"

(محمد 24/47)

جیسے غصہ میں کوئی کہتا ہے، اس طرح ارشاد ہو رہا ہے، جھلائے ہوئے انداز میں۔ "یہ قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟"

تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اسے یہ شکایت نہیں ہے کہ حفظ کیوں نہیں کرتے، شکایت یہ ہے کہ عقلوں سے کام کیوں نہیں لیتے؟ غور کیوں نہیں کرتے؟

حضور والا! امام کو اس سے اتنی تکلیف ہوئی کہ جہاں لگے ہوئے بیٹھے تھے، تشریف فرما تھے، سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اللہ بالاتر ہے، اس سے

جو یہ ظالم لوگ کہتے ہیں، بہت اونچا ہے، برتر ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا جو اصل حقیقت تھی، سننے والا اس لائق تھا کہ اسے بتایا جائے:

"نَحْنُ وَجْهُ اللّٰهِ الْبَاقِيَه" (بصائر الدرجات فی فضائل آل محمد ص ۶۵، تھوڑے فرق کے ساتھ)

"ہم وہ چہرے ہیں جو باقی رہنے والے ہیں"

اب یہ ذکر آ گیا ہے تو قرآن مجید کی دو آیتیں یاد آتی ہیں، دو جگہ صور پھونکنے کا ذکر ہے۔ ایک جگہ ہے:

"يَوْمَ يُنْفَخُ" (النمل 87/27)

صور پھونکا جائے گا زمین آسمان میں جتنے ہیں سب گھبرا جائیں گے۔ خوف و دہشت طاری ہو جائے گا۔ اس صور سے جو آدمیوں کے دھماکے سے خوف و دہشت طاری ہوتا ہے۔ یہ خوف اس سے مختلف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا دھما کا ہوگا۔ خوف و دہشت طاری ہو جائے گا۔

"اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ"

"سوائے ان کے جن کو اللہ چاہے"

معلوم ہوا کہ عام طور پر گھبراہٹ مگر اس میں استثنیٰ ہے کہ سوائے ان کے جنہیں اللہ چاہے۔

دوسرے صور کا ذکر وہ ہے، صور فنا جسے کہنا چاہیے۔ (الزمر 68/39)

صور پھونکا جائے گا تو جتنے آسمان اور زمین میں ہیں، سب بے حس و حرکت ہو کر گر جائیں گے۔ یہ معنی صور کے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی موجود "اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ"۔ سوا ان کے جنہیں اللہ چاہے۔ پہلا صور وہ تھا جس سے عام

گھبراہٹ طاری ہوجائے گی مگر نفوسِ مطمئنہ ہیں کہ ان پر اس صور کا اثر نہیں ۔دوسرا صور وہ ہے جس سے سب ختم ہوجائیں گے مگر کچھ نفوسِ باقیہ ہیں، ان پر اس صور کا بھی اثر نہیں ہوگا۔اب وہی ہستیاں ہیں جو وجہ اللہ کی مصداق ہیں، وہی "اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ" کے استثنٰی کا مصداق ہیں جو ہر صور کے اثر سے مستثنٰی ہیں۔

اب اس کے سوا تیسرے صور کا مجھے پتہ نہیں۔تیسرا صور وہ ہے کہ جو مر گئے تھے، اُس سے وہ جی اُٹھیں گے۔تو جی کر اٹھیں گے وہی جو مرے ہوں گے۔یہی نفس ہیں بلند انسان کے جن کو اُس نے اپنی دلیل قرار دیا۔اس میں جتنا درجہ بلند ہے، جتنا نفس کامل تر ہے، اتنا ہی اس کو اپنا نفس کہہ دیا کہ یہ ہمارا نفس ہے۔اس کے ذریعہ ہمیں پہچانا جاسکتا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ شہداء کے لئے جو زندگانیٔ جاوید کی بشارت دی گئی ہے، اس کا انحصار صرف تلوار سے شہید ہونے والوں پر نہیں ہے، اس کے لئے ایک لفظی دلیل کہ دو آیتیں ہیں حیاتِ شہداء کی "لَاتَقُوْلُوْا" اور ایک "لَاتَحْسَبَنَّ" جو میں پیش کر چکا ہوں۔دونوں جگہ کلمہ حصر یعنی "اِنَّمَا" نہیں ہے۔"اِنَّمَا" کلمہ حصر ہوتا ہے جو قرآن مجید میں ہے:

"اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ"

(الاحزاب 33/33)

"اِنَّمَا" سے انحصار ہوتا ہے کہ ان کے سوا اور کوئی نہیں۔لیکن یہاں بس یہ کہا گیا کہ ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں۔مگر یہ نہیں کہا گیا کہ بس یہی زندہ ہیں۔کلمہ حصر "اِنَّمَا" ان میں کہیں نہیں ہیں۔دنیا حیاتِ نبیؐ میں اُلجھ رہی ہے

کہ زندہ ہیں یا نہیں۔ قرآن مجید سے ان تمام نفوس کا زندہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ رسول سے کیا مخصوص ہے؟ وہ تمام افراد زندہ ہیں۔ ان میں تلوار والی شہادت ایک ہی ذات کے لئے ہے۔ مگر حیاتِ جاودانی میں کم سے کم میرا ایمان یہی ہے کہ سب شریک ہیں۔ کوئی ایک نہیں جو اس حیاتِ جاودانی سے محروم ہو۔ رسول کے بارے میں دنیا بحث کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شہادت ہے کیا چیز؟ شہادت پیغمبر اسلام کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ تو جس کی ایک تعلیم سے حیاتِ جاودانی ملتی ہو، تو جو خود مرکز فیض ہو، اُس کے لئے فنا ہوگی؟ میں کہتا ہوں کہ بے شک شہادت بہت بڑا مرتبہ سہی مگر جب رسول کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے تو میں یوں کہوں گا، یہ کوئی نہ کہے کہ شہیدوں کی شان کے خلاف، ان کی شان رسول کی شان کے سامنے نہیں آسکتی۔ میں کہتا ہوں کہ جس دروازے سے زندگانیِ جاوید کی بھیک تقسیم ہورہی ہو، وہ خود محرومِ زندگیِ جاوید کس طرح ہوسکتا ہے؟

میں تصور نہیں کرسکتا کہ پیغمبر اسلام اس حیات سے محروم ہوں جو شہداء کے لئے بنص قرآن ثابت ہے اور جس کے وہ بھی قائل ہیں جو حضور کی حیات کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ حضور کی حیات معرضِ بحث میں لیکن شہیدوں کی حیات کے سب قائل۔

ایک سوال جو خواہ مخواہ کیا جاتا ہے، وہ بھی غلط کہ جو زندۂ جاوید ہو، اس کا ماتم نہیں کرنا چاہئے۔ مجھ جیسا جاہل آدمی رسولؐ کو زندہ سمجھ رہا ہے تو کیا رسولؐ کی بیٹی اس حقیقت سے واقف نہیں تھیں کہ میرے بابا زندۂ جاوید ہیں؟ لیکن واقعہ ہے کہ دنیا میں کوئی بیٹی باپ کو اتنا نہیں روئی ہوگی جتنا سیدہ عالم

کہ اپنے بابا کو روئی ہیں۔ اور عالم یہ کہ نہ دن کو چین اور نہ رات کو آرام۔ گریہ سے رونے کی ابتداء اسی وقت ہوگئی تھی مگر ذرا تمیز و بدتمیزی کا فرق تھا۔ لیکن ابتداء اسی وقت ہوگئی تھی۔ اگر محلہ کے کسی گھر میں کوئی مصیبت ہو جائے تو کہرام سے نیند تو بے چین ہوگی۔ کھانا تو خوشگوار نہیں ہوگا۔ چاہے شناسائی نہ ہو، غم وہ ہے جو غیر متعلق کو متعلق بنا دیتا ہے۔ خوشی میں وہی شرکت کرتا ہے جو پہلے سے شناسائی رکھتا ہو لیکن غم میں فطری طور پر وہ بھی شریک ہو جاتا ہے جس کی شناسائی نہ ہو۔ تو اگر کسی غیر کے ہاں بھی گریہ ہو رہا ہو تو آپ کو ہنسنے میں دلچسپی نہیں ہوگی، قہقہے لگانے کو دل نہیں کرے گا۔ باوجود اجنبی ہونے کے ایک ملال کی فضا تو آپ کے گھر میں بھی ہو جائے گی۔ نہ کھانے میں مزا ہوگا، نہ سونے میں۔ لیکن چودہ سو برس کے اخلاق کی پستی کے باوجود آج کسی کی انسانیت یہ اجازت نہیں دے گی کہ وہ گھر پر جائے اور جا کر یہ کہلوائے کہ تم لوگوں کے رونے سے ہماری نیند بے چین ہوتی ہے۔ تمہارے رونے سے ہمیں کھانے میں مزا نہیں آتا۔ آج اخلاق کی پستی کے باوجود انسانیت ہرگز اجازت نہیں دیتی۔

لیکن میں کیا کروں کہ اس خلق عظیم اور انسانیت کے معلم کے دنیا سے اٹھنے کے ساتھ ہی آس پاس والوں نے جو فاطمہ زہراؑ کے ہمسائے تھے تو کیا وہ رسول کے ہمسائے نہیں تھے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ پاس رہنے سے کوئی اثر نہیں ہوتا جب تک صلاحیتِ ظرف نہ ہو۔ اس وقت یہ مثال سامنے آتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس پورا وفد آتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت فاطمہؑ سے کہئے کہ دن رات وہ گریہ کرتی ہیں تو نہ ہمیں رات کو نیند آتی ہے، نہ ہمیں

کھانے پینے میں مزا ملتا ہے۔ ہماری طرف سے کہیے کہ یا دن کو روئیں یا رات کو۔ یعنی ابھی تک کم از کم گریہ کے بدعت ہونے کا تصور نہیں ہوا تھا ورنہ یہی کہہ دینا کافی تھا۔ مگر یہ اپنی زحمتوں کا ذکر کر رہے ہیں کہ یا تو دن کو گریہ کریں، رات کو خاموش رہیں یا رات کو گریہ کریں، دن کو خاموش رہیں۔ مجھے اور آپ میں سے ہر ایک کو اس فرمائش کے سننے سے تکلیف ہوئی تو علیؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

مگر وہ اُس امین کے جانشین تھے کہ انہوں نے اس پیغام کو پہنچانا بھی ضروری سمجھا۔ گئے اور بتقاضائے احتیاط کتنا ہی ہلکا کر کے ارشاد فرمایا ہو لیکن جو اصل بات تھی، وہ تو کہنی ہی تھی۔ پہلے تو سیدہ عالم نے یہ جواب دیا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہاری زحمتوں کی عمر طولانی نہیں ہے، مجھے میرے بابا خبر دے چکے ہیں کہ میں بہت جلد اُن کے پاس چلی جاؤں گی۔ جواب تو یہ دے دیا اور کہا کہ میں کوشش بھی کروں گی ان کی شکایت کو دور کرنے کی۔ گریہ پر بس تو نہ تھا کہ اس کے لئے اوقات کا تعین کر سکتیں مگر صبح ہوئی تو حسنین کا ہاتھ پکڑ کر جنت البقیع میں چلی جاتی تھیں۔ جنت البقیع زیادہ دور نہیں ہے۔ صرف درمیان میں بنی ہاشم کا محلہ ہے۔ حسنین کا ہاتھ پکڑ لیتی تھیں اور جنت البقیع میں چلی جاتی تھیں۔ ہوتا یہ تھا کہ ادھر فاطمہ زہراؑ نے رونا شروع کیا، اُدھر بچے شریکِ گریہ ہو گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر وقت مسلسل مجلس برپا رہتی تھی۔ تو اس لئے سیدہ عالمؑ نے چاہا کہ جب میں جاؤں تو میرے ساتھ جو شریک غم ہیں، جو ہم نوائے نالہ و فریاد ہیں، انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اس لئے حسنین کو اپنے ساتھ لے کر جاتی تھیں اور دن بھر روتی رہتی

تھیں۔شروع میں کوئی سایہ نہ تھا، زیر سایہ آفتاب بیٹھی رہتی تھیں۔ توامیر المومنین علیہ السلام نے ایک حجرہ بنادیا جس کا نام بیت الحزن تھا۔جب تمام روضے جنت البقیع کے برباد ہوئے تو سیدہ عالم کی وہ یادگار بھی مسمار کردی گئی۔تواس طرح دن رات گریہ کرتی رہیں۔اب یہ بات یاد آئی کہ بلال مؤذن رسول ہیں انہوں نے بعد پیغمبر یہ عہد کرلیا تھا کہ میں رسول کے بعد کسی کے لئے اذان نہیں دوں گا اسی سے ان کی حق شناسی ظاہر ہے مگر جانتے تھے کہ مدینہ میں رہ کر اسے نبھانا مشکل ہے لہٰذا مدینہ چھوڑ دیا شام کے قریب ایک جگہ جاکر رہنے لگے۔کچھ عرصے تک وہاں رہے مگر جس شخص کو رسول سے اتنا لگاؤ ہو پیغمبر کو اس سے لگاؤ نہیں ہوگا۔خواب میں رسول کو دیکھا کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بلال ہم نہیں رہے تو تم نے ہماری ڈیوڑھی بھی چھوڑ دی ۔بس اب خواب سے چونکے تو بے تابانہ انداز میں سامانِ سفر بھی نہیں لیا پشتِ شتر پرسوار ہوگئے۔تیز رفتاری کے ساتھ مدینہ کی طرف۔جب قریب مدینہ پہنچے تو ایک ساتھی مسافر نے مدینہ میں جاکر خبر دے دی کہ بلال آرہے ہیں اور کل تک پہنچ جائیں گے تو مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے کہ پورا مدینہ بلال کے استقبال کے لئے اُمڈ آیا یہاں تک کہ پردہ دار عورتیں تک گھروں سے باہر نکل آئیں کہ بلال آرہے ہیں۔مؤذن رسول آرہے ہیں۔جب بلال مدینہ پہنچے تو یہ تاریخی جملہ ہے۔وفاتِ رسولؐ کے بعد سے رونے والوں اور رونے والیوں کا یہ کہرام دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔اب پتہ چلا کہ وفات رسول کے وقت بھی کہرام تھا۔عام مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں سے تھوڑی مطلب تھا۔کہرام اس وقت بھی تھا اور کہتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد سے یہ کہرام سننے میں

نہیں آیا تھا۔ کہرام اس اجتماعی صدا کو کہتے ہیں جس میں شخصیتیں گم ہو جائیں۔ اس وقت مدینہ میں صرف صحابہ ہیں اور صحابیات اور کہرام میں نے کہا کہ اجتماعی عمل کا نام ہوتا ہے تو دنیا یاد رکھے کہ یہ اجماع صحابہ ہے گریہ کے سنت ہونے پر۔ بلال سیدھے روضۂ رسول پر پہنچے وہاں حسن و حسین نظر آئے انہیں اٹھا کر کاندھوں پر چڑھا لیا۔ سب کہہ رہے ہیں کہ حسن و حسین کو ہمیں دے دیجئے مگر یہ کہتے ہیں کہ میرے سامنے تو وہ منظر ہے جب رسول یونہی کاندھوں پر چڑھاتے تھے۔ آج مجھے وہ سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد جسے رسول کی ڈیوڑھی سمجھتے تھے وہاں آئے۔ یعنی خانہ سیدہ عالم پر اور دروازہ پر آکر اطلاع کرائی کہ بلال حاضر ہوئے ہیں۔ بلال کا نام سنتے ہی دل پر کیا گزر گئی مگر یہ وارث خلق عظیم ہیں۔ جواب سلام کے ساتھ کہلوایا کہ بلال جب سے بابا کا سایہ سر سے اٹھا ہے تمہاری آواز اذان کو بھی کان ترس گئے ہیں۔ بلال نے جو واقعہ تھا وہ بیان کیا کہ میں نے عہد کیا ہے کہ رسول کے بعد کسی کے لئے اذان نہیں کہوں گا ہاں جو ناواقف ہوں ان کے لئے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ جیسے نذر امر شرعی ہے جیسے قسم امر شرعی ہے ویسے ہی عہد عمل شرعی ہے اس کا صیغہ ہے اس کی مخالفت حرام ہے تو انہوں نے کوئی رسمی عذر نہیں کیا تھا شرعی عذر تھا۔ سیدہ عالم نے یہ سنا تو فرمایا بلال سے جا کر کہو کہ تمہیں میرے حق کی قسم ایک دفعہ میرے لئے اذان دے دو۔ بلال نے دبی زبان سے بھی وہ بات نہیں کہی یعنی پھر کہتے کہ یہ رسمی عذر نہیں تھا یہ تو عہد کیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے تربیت یافتہ افراد تھے چاہے وہ غلام ہوں چاہے مؤذن۔ عوام نہیں ہوتے تھے۔ اجتہاد نام اسی کا ہے ایک لمحے میں انہوں

نے دلیل مرتب کی۔ دل کے اندر اور بجلی کی رفتار سے انہوں نے نتیجہ نکالا جونہی انہوں نے کہا میرے حق کی قسم۔ فوراً انہوں نے دلیل مرتب کر لی کہ میں نے یہی تو قسم کھائی ہے کہ رسول کے سوا کسی کے لئے اذان نہیں دوں گا اور یہ کون کہہ رہا ہے یہ وہ کہہ رہی ہیں جنہیں رسولؐ نے اپنا جز کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کی رضا میری رضا ہے اس کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو بات فاطمہ کے لئے ہو وہ غیر رسول کے لئے نہیں ہے تو میرے عہد کے خلاف نہیں ہوگا اگر فاطمہ زہرا کے کہنے سے اذان دوں۔ یہ سوچا اور کہا سمعاً وطاعة۔ سنی اور اطاعت کی۔ اذان شروع کی چار مرتبہ اللہ اکبر کہا سیدہ کو بابا کا دور یاد آ گیا ادھر بلال کی آواز آئی ادھر فرمایا بابا بلال اذان دے رہے ہیں آپ نماز میں جانے کی تیاری نہیں کرتے۔ بے تابی کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ اذان آگے بڑھی اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ فاطمہ کے گریہ میں اضافہ ہوا۔ مؤذن نے کہا اشہد ان محمد رسول اللہ۔ بس یہ کہنا تھا دوسرا جز کہنے نہیں پائے تھے کہ کنیز دوڑتی ہوئی آئی اس نے کہا بلال اذان موقوف کرو فاطمہ زہرا کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ روح جسم سے نکل جائے گی بس اہلِ عزا میں کہتا ہوں اے مخدومہ عالم اے سیدۃ النساء اے خاتون جنت آپ نے اپنے باپ کا نام بڑی عزت کے ساتھ سنا مگر سکینہ کے دل سے پوچھئے کہ کربلا سے کوفہ تک، کوفہ سے شام تک کس طرح باپ کا نام سنتی رہی۔

# فلسفۂ شہادت

# چوتھی تقریر

- ''شہید'' کی اصطلاح بھی قرآنی ہے۔
- مصنوعی اور حقیقی شہادت میں فرق۔
- جان بھی خدا کی امانت ہے۔
- یہ دیکھنا ہے کہ جان جائے گی تو سوارت ہوگی یا اکارت جائے گی۔
- فلسفے اور سائنس کے نام پر انکارِ خدا کا فیشن۔
- اطاعتِ جبری اور اطاعت اختیاری۔
- ریاکاری پر کڑی تنقید۔
- عرش اور بیت اللہ کے ذیل میں نسبت کی بحث۔
- جہاد اذنِ معصومؑ سے ہوتا ہے۔غیبت میں نائب امامؑ کا اذن درکار ہے۔
- مقتولِ مظلوم بھی شہید ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (آل عمران 169/3)

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں"۔

یہ آیت شہیدوں کے زندۂ جاوید ہونے کو بتاتی ہے۔ یعنی حیاتِ شہداء کا ثبوت دیتی ہے۔ مگر ایک پہلو غور طلب ہے کہ ہمیں ان ہستیوں کا نام معلوم ہے کہ انہیں شہید کہتے ہیں اور اس کی جمع شہداء ہے۔ اسی لئے ہم نے کہا کہ یہ حیاتِ شہداء سے متعلق ہے۔ لیکن اس آیت میں شہداء کا لفظ استعمال نہیں ہوا، حالانکہ بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مختصر لفظ سے مفہوم ادا ہو جائے تو اُسے پھیلا کر کئی الفاظ میں ادا نہیں کرنا چاہئے۔ بہتر یہ تھا کہ کہا جاتا کہ شہداء کو مردہ نہ سمجھو۔ کیا یہ ہماری بنائی ہوئی اصطلاح ہے کہ ہم ان لوگوں شہداء کہتے ہیں؟ یہ بات بھی از روئے قرآن غلط ثابت ہے۔ یہ اصطلاح علماء کی وضع کردہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں یہ الفاظ ان معنی میں موجود ہے:

"مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ"

(النساء 69/4)

"جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں جن کو ہم نے اپنی نعمت خاص سے نوازا ہے۔ وہ نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین"۔

دیکھئے! یہاں شہداء کا لفظ موجود ہے۔ تو پھر یہ تصور تو غلط ثابت ہوا کہ یہ محاورہ علماء کا قرار دیا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاح موجود ہے تو پھر لفظ شہداء کیوں نہ کہا گیا؟ شہداء کے لفظ کی بجائے یہ جملہ کیوں لایا گیا:

"اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا"

تو اس پر غور کیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بعض الفاظ کو اگر اکیلا استعمال کیا جائے اور ان کی تشریح نہ کی جائے تو ان کی القاب کی سی حیثیت ہو جاتی ہے۔ اگر کہا جاتا کہ شہیدوں کو زندۂ جاوید سمجھو یا شہیدوں کو مردہ نہ سمجھو تو شہید کا لفظ ہمارے ذہن کی پیداوار کا پابند ہو جاتا کہ جسے ہم شہید سمجھ لیں، بس پھر وہ زندۂ جاوید ہے۔ یعنی شہداء کے لفظ کی تشخیص کرنا کہ کون کون شہداء ہیں؟ پھر وہ ہمارا کام ہو جاتا کہ ہم بتائیں کہ کون کون شہداء ہیں۔ قرآن بھیجنے والے کو معلوم تھا کہ شہادت کا لفظ اتنا ارزاں ہو جائے گا کہ جو بھی کسی صورت میں قتل ہو، اُسے شہید ہی قرار دیا جائے گا۔ اسے دیکھا ہی نہیں جائے گا کہ کس راہ میں شہید ہوا یعنی قتل کس راہ میں ہوا؟ بس ادھر قتل ہوا، اُدھر وہ شہید ہو گیا۔ چاہے جس وجہ سے قتل ہو۔ بلکہ اکثر تو اس مشاہدہ کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ قتل ہوا، بس ایک قبر دیکھ لی اور اُسے مرجعیت دینا ہوئی تو کہہ دیا کہ شہید کی قبر ہے۔ نذرانے چڑھنے لگے، چڑھاوے آنے لگے۔ تو گویا لفظ شہید ہمارے محاورات کا پابند ہو جاتا۔ لہٰذا خالق نے دونوں آیتوں میں لفظ شہید استعمال ہی نہیں کیا

بلکہ معیار شہادت بتایا کہ ہم سے سنو کہ اصل شہادت کا نتیجہ زندگی جاوید کیونکر بن سکتا ہے؟ قتل ہو اللہ کی راہ میں۔ اب قتل ہونا تو آنکھ دیکھ سکتی ہے مگر اللہ کی راہ کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہم آپ تڑپتا ہوا لاشہ دیکھ سکتے ہیں، زخمی جسم دیکھ سکتے ہیں، زخموں کو شمار کر سکتے ہیں، گولیوں کے نشان دیکھ سکتے ہیں لیکن ہم آپ اللہ کی راہ نہیں دیکھ سکتے اور جب تک اللہ کی راہ کو نہیں سمجھیں گے، اس وقت تک شہید کہنے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی شہید سمجھنے کا حق ہے اور جب شہید سمجھنے کا حق نہیں ہے تو زندۂ جاوید سمجھنے کا حق بھی نہیں ہوگا۔ وہ تو اسی سے متعلق ہے جو اللہ کی راہ میں قتل ہو۔ بغیر مقصد کو دیکھے ہوئے ہم کسی مقتول کو شہادت کی سند نہیں دے سکتے۔

بات یہ ہے کہ اللہ کی نظر میں جان کی کوئی قیمت نہ ہوتی تو ہماری جان تھی، جب چاہے دے دیتے اور جس صورت سے یہ جان جاتی، صلہ مل جاتا۔ لیکن اس جان کی بھی پیش خدا قیمت ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہماری جان ہے، لہٰذا جب چاہیں دے دیں۔ اس کے لئے ایک مختصر دلیل یہ ہے کہ اگر اپنی جان ہوتی تو خودکشی جرم نہ ہوتی۔ خودکشی کا گناہ اور جرم ہونا ثبوت ہے اس کا کہ جان اپنی نہیں ہے۔ متفق علیہ اسلامی قانون کی روشنی میں دیکھئے۔ اگر جان کی قیمت نہ ہوتی تو یہ حکم ہوتا کہ روزہ رکھو اور مکمل کرو۔ زیادہ سے زیادہ مر ہی تو جائیں گے۔ خدا کے ایک حکم کے سلسلہ میں جان جائے گی تو کیا کہنا۔ لیکن جی نہیں! جان کی قیمت اس کی نظر میں ہے کہ روزہ اگر مضر ہے تو ناجائز۔ اگر اندیشہ ہے کہ بیمار ہو جاؤ گے، تب بھی روزہ نہ رکھو۔ اگر بیمار ہو اور اندیشہ ہو کہ بیماری میں طول ہو جائے گا، تو بھی روزہ نہ

رکھو۔اگر روزہ رکھا تو وہ باطل ہوگا اور فاقہ ہوگا، روزہ نہیں ہوگا۔ ضعیفی ہے، اولاد منع کرتی ہے کہ روزہ نہ رکھئے، آپ کے لئے نقصان دہ ہے۔ ڈاکٹر بھی بتاتے ہیں کہ روزہ رکھنا صحت کے لئے مضر ہے۔ عالم دین سے پوچھا تو انہوں نے بھی روزہ نہ رکھنے کے لئے کہا تو روزہ نہیں رکھنا چاہئے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ عمر بھر تو روزہ رکھتے رہے، اب جب دنیا سے چل چلاؤ ہے، تو روزہ نہ رکھیں؟ یعنی اس عبادت کو آخر وقت میں ترک کریں؟ ہماری طبیعت اس کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ احکامِ شرع کی روشنی میں، مَیں تو یہ کہوں گا کہ عمر بھر تو عبادت کرتے رہے اور اب چلتے وقت بھی گناہ نہ کریں۔ وضو مضر ہے، نہیں وضو نہ کرو، شرع کا حکم ہے تیمم کرلو۔ جیسے روزہ ساقط تھا، یہاں وضو کا نائب رکھ دیا گیا کہ اگر وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کرلو۔ نماز وہی مرتبہ رکھے گی جو وضو کے ساتھ ہوتی۔ نمازی حضرات کہتے ہیں کہ تیمم سے نماز دل کو نہیں لگتی، وہ خدا کو قبول ہے۔ تو اگر آپ دل کی خاطر نماز پڑھا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے، تیمم کر کے نماز نہ پڑھئے اور اگر خدا کے حکم سے نماز پڑھتے ہیں تو جب اس کا حکم وضو کا تھا، وضو کیجئے اور جب اس کا حکم تیمم کا ہے تو تیمم کیجئے۔ آپ کا دل کیا چیز ہے؟ عبادت کا تعلق اللہ کے حکم سے ہے، آپ کے دل سے نہیں ہے۔ اگر غسل کی ضرورت ہے اور غسل نہیں ہو سکتا تو غسل کا بدل وہی تیمم۔ حالانکہ اگر یہاں دنیاوی عقل سے کام لیا تو پھر دل یہ کہے گا کہ صاحب غسل میں تو تمام جسم صاف ہوتا، اگر غسل نہیں ممکن ہے تو وضو ہی اس کا قائم مقام ہوجاتا، کم از کم اتنا حصہ تو صاف ہوجاتا لیکن شریعت کیا کہتی ہے کہ اگر دس دفعہ وضو کرلو گے غسل کے بدلے تو کام نہیں چلے گا، ایک دفعہ تیمم کرلو۔

یہاں دیکھئے کہ طبیعت پر کتنا بار ہے کہ بجائے صاف وضو کے میلے ہو جاؤ اور مٹی مل لو۔ مگر غسل ممکن نہیں ہے۔ تو ہم اپنی عقل سے وضو کو اس کا قائم مقام نہیں بنا سکتے جسے اُس نے قائم مقام بنایا۔ ایک اپنا عمل اُس کا جانشین تو ہم نہیں بنا سکتے اور اس کے رسول کا جانشین ہم بنالیں!

اگر ہماری جان اس کی نظر میں کوئی قیمت نہ رکھتی تو کیوں یہ حکم ہوتا کہا جاتا کہ مرجاؤ مگر روزہ رکھو۔ چاہے مرجاؤ مگر غسل، وضو ضرور کرو۔ معصومینؑ کے زمانہ میں ایسے جاہل قسم کے بخیالِ خود عبادت گزار تھے۔ ایک شخص بیمار تھا۔ تیمارداروں کو معلوم ہوا کہ اسے غسل کی ضرورت ہے۔ وہ اتنا بیمار تھا کہ خود غسل بھی نہیں کرسکتا تھا۔ تیمارداروں نے اس کو غسل دے دیا، نہلا دیا۔ اُسے کُزاز ہو گیا۔ بہت ہی مہلک مرض اسے ہو گیا نہلانے سے۔ پتا نہیں اس مرض کو آج کل کیا کہتے ہیں بہر حال وہ بیچارہ واقعی غسل کا مستحق ہو گیا۔ کسی نے جا کر امام سے بیان کیا کہ یہ ہوا ہے۔ آپ نے اس کے تیمارداروں کے لئے جملہ ارشاد فرمایا:

"قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ" ''انہوں نے اس کو قتل کیا، اللہ انہیں قتل کرے گا'' (الکافی۔ جلد ۳، کتاب الطہارۃ)

یہ تہذیبِ معصومین میں سخت ترین جملہ ہے جو ارشاد فرمایا اس جاہلانہ ذوقِ عبادت پر۔ تو جان ہماری اس کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتی تو یہ حکم کیوں ہوتا؟ اسی طرح حج۔ اگر راستہ غیر مامون ہے، خطرۂ جان ہے تو حج ضروری نہیں۔ شرائطِ استطاعت میں امنیت راہ داخل کہ راستہ پر امن ہو، غیر معمولی خطرۂ جان نہ ہو۔ تو ان تمام احکام میں جان کی حفاظت پیش نظر رکھی

۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری جان اس کے نزدیک قیمت رکھتی ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اندھادھند جان نہیں دینی کہ کیا ہوگا؟ گولی ہو تو کھالیں گے،لوگ کہیں گے کہ بہت بہادر ہیں۔یاد رکھئے کہ دنیا کے مقابلہ میں بہادری بہت قابل تعریف ہے۔اللہ کے مقابلہ میں بہادری قابل تعریف نہیں ہے۔اگر موقع ایسا ہے کہ حفاظتِ جان واجب ہے تو یہ بہادری نہیں ہے۔یہ درحقیقت احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں جرأت ہے۔یوں تو بڑا بہادر شیطان تھا جس نے (معاذ اللہ) اس کے منہ پر کہہ دیا۔آج کل اس کو اخلاقی جرأت کہا جاتا ہے۔اس بے باکی کو اخلاقی جرأت کہتے ہیں۔یقیناً شیطان بڑی اخلاقی جرأت رکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نہیں،یہ نہیں ہوسکتا کہ مٹی کے پتلے کے سامنے میں سر جھکاؤں۔مجھ سے کہتا ہے کہ میں اس کو سجدہ کروں جبکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے،یہ خاک سے پیدا ہوا ہے۔تو میں اس کے سامنے سر کیونکر جھکاؤں؟تو کتنا عذابِ الٰہی نازل ہوا کہ ہمیشہ کے واسطے راندۂ درگاہ ہوگیا حالانکہ بیچارہ اپنے خیال میں ایک طرح کے شرک سے بچ رہا تھا۔اللہ کو بے شمار سجدے کرچکا تھا۔غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنے سے بچ رہا تھا تو خالق اتنا ناراض کیوں ہوا؟سمجھتا کہ اس نے مجھ کو بہت سجدے کیے ہیں،خیر اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتا تو نہ سہی،اب بھی میرے سامنے سجدے کا وقت آئے گا تو ضرور سجدہ کرے گا۔واقعی کرتا۔میں کہتا ہوں کہ جب لڑ رہا تھا،اس وقت بھی رب رب کہہ رہا تھا۔میرے مالک!میرے پروردگار!یعنی اسے برابر مانے جارہا تھا۔اس کی خدائی کا قائل تھا۔فرعون نہیں تھا کہ دعوائے خدائی

کردے۔ نمرود نہیں تھا کہ دعوائے اُلوہیت کردے۔ برابر اُس کی ربوبیت کو سرنامہ خطاب قرار دے رہا ہے۔ رب رب ہر قدم پر۔ ہر جملے میں رب کہہ رہا تھا۔ مگر خدا نے کہا کہ مجھے ایسے سجدے نہیں چاہئیں جن کے سامنے جھکنے کے لئے کہوں تو ان کے سامنے جھکنے سے انکار کرے۔ یعنی منظورِ نظر افراد سے سرتابی مجھ سے سرتابی ہے۔

انسان اس کے احکام سے سرتابی کرے، اپنے ذوق کی بناء پر، اپنے دل کی خاطر کہ میری طبیعت کو یہ نماز نہیں لگتی۔ میرے دل کو یہ وضو نہیں لگتا۔ یہ احکامِ خدا سے سرتابی ہے، انحراف ہے۔ معلوم ہوا کہ ہماری جان اس کی نظر میں قیمت رکھتی ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جان اندھا دھند نہیں دینا ہے۔ جب جان جانے کا خطرہ ہو تو یہ دیکھنا ہے کہ جان جائے گی تو سوارت ہوگی یا اکارت جائے گی۔ یہ سوارت اور اکارت ہونے کا تعلق مقصد سے ہے۔ اگر پست مقصد کے لئے یا بلا مقصد ہوگئی تو اکارت گئی اور بلند مقصد کی خاطر جان گئی تو سوارت ہوئی۔

میں نے کل عرض کیا تھا کہ انسان سے بالاتر بس خالق ہے۔ پس اگر اللہ کی راہ کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے جان گئی تو وہ اکارت گئی اور ہلاکت ہوئی اور اگر اللہ کے مقصد کی خاطر جان گئی، وہ سوارت ہوئی۔ وہ سنتِ کائنات کے مطابق ہے۔ یعنی سنتِ کائنات یہ ہے کہ پست بلند پر قربان ہو۔ جمادات نباتات پر قربان ہوئے، نباتات حیوانات پر قربان ہوئے اور حیوانات انسان پر قربان ہوئے۔ تو اب اگر انسان قربانی پیش کرے تو اپنے سے بالاتر کی خاطر اور اس سے بالاتر صرف اللہ ہے۔

مگر اب صاحبانِ فہم غور کریں کہ اب ایک مشکل ہے کہ اس سے پہلے ہر ایک شے جو اپنے سے بلند تر کی خاطر قربان ہوتی تھی، وہ بلند محتاج ہوتا تھا یعنی پودے غذا کے محتاج ہیں، اجزاء کے محتاج ہیں۔ زمین نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ان اجزاء کو جو اس لائق تھے کہ پودے کا جزو بن سکیں، اس کی خاطر پیش کر دیا، یہ قربانی ہوئی۔ تو پودا محتاج تھا ان ذرات کا۔ اگر یہ ذرات اس میں شامل نہ ہوتے تو پودے کی ہستی قائم نہ ہوتی۔ اس ضرورت کو زمین نے پورا کیا تو قربانی ہوئی۔

اسی طرح نباتات انسان اور حیوان کے کام آئے۔ تو حیوان محتاجِ غذا تھا۔ اگر غذا نہ ملے تو یہ ہلاک ہو جائے۔ پودوں نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اپنی ہستی کو فنا کر دیا، اس کی غذا رسانی کے لئے۔ پھر بقا حاصل ہوئی اور ترقی کا درجہ ملا۔ حیوان میں شامل ہو گئے۔ پس حیوان محتاج غذا تھا لیکن انسان سے جو بلند تر ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، نہ اُسے کوئی ضرورت ہوتی ہے، نہ اس کے دامن پر گردِ تغیر و زوال و انتقال آسکتی ہے۔ تمام دنیا مل کر اس کے سامنے سر بہ سجود ہو جائے، تو اس کے جاہ و جلال میں ذرہ برابر اضافہ نہیں اور سب مل کر منکر ہو جائیں تو اس کے جاہ و جلال و جبروتِ قدرت میں ذرہ برابر کمی نہیں۔ اس کے لئے فوج و لشکر کی ضرورت نہیں۔ فوج و لشکر سب مخلوق ہیں، وہ جب چاہے ان کو تباہ کر دے۔ اس کی ذات ان کی محتاج نہیں ہے۔ ایسی بے نیاز مطلق ہستی ہے کہ نہ انکار سے اس کا نقصان، نہ اقرار سے اس کا فائدہ۔

ہم نے ایک ملک کے متعلق سنا، صحیح وغلط کا پتہ نہیں۔ اس ملک والوں نے یہ کہا کہ ہم نے خدا کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے۔ اب خبریں آنے لگیں کہ وہاں مدرسے اور مسجدیں کھل گئے یعنی وہاں عبادت کی آزادی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خدا آ گیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہم نے خدا کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ زبان ان کے منہ میں ہے، جو مرضی کہہ دیں۔ لیکن ان کے کہنے سے کیا واقعی وہ نکل ہی گیا؟ یہ تو ان کا کہنا ہے کہ نکال دیا لیکن واقعی کیا وہ ان کے ملک سے نکل گیا، چلا گیا؟ یہ اُس ملک والوں نے کہا۔ جس شخص نے بھی سائنس پڑھ لی تو ترقی کی نشانی یہ سمجھ لی کہ میری سمجھ میں خدا کا وجود نہیں آیا، حالانکہ ذہن کے اندر نہ اقرار ہے، نہ انکار ہے۔ لیکن اس بات کا اظہار فیشن کی بناء پر ہے کہ میں فلسفی ہوں، میری سمجھ میں خدا کا وجود نہیں آیا۔ باغی ہونا بہت ترقی کی نشانی ہے۔ سماج سے باغی، ماں باپ سے باغی، روایاتِ خاندانی سے باغی اور سب سے بڑی اور اعلیٰ قسم یہ کہ خدا سے باغی۔

مجھے اس وقت فلسفے اور منطق کی کوئی بحث نہیں کرنی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ بڑے باغی ہیں تو جب جانوں کہ جب آپ پورے باغی ہوں، جب وہ بھیجے تو آیئے نہیں اور جب وہ بلائے تو جایئے نہیں۔ حالانکہ کتنے ہی بڑے بلند وبانگ دعوے بغاوت کے کرنے کے عادی ہوں، جب اُس نے بھیجا، تب آئے اور جب وہ بلائے گا تو چلے جائیں گے۔ اس وقت بغاوت بھول جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ جس وقت آئے تھے تو کم از کم روتے تو تھے اور جب جانا ہوگا تو سانس تک نہ لیں گے، چپکے سے چلے جائیں گے۔ یہ ہے انسان، ضعیف البیان کی حقیقتِ بغاوت۔ یہ کیا بغاوت

کرسکتا ہے؟ اگر وہ اپنے اختیار کو سلب کرلے، اس نے زبان اس کے دہن میں دے رکھی ہے تو اقرار کرے یا انکار کرے۔ لیکن وہ اس زبان کو خاموش کردے تو یہ بات تو کرے؟ اُس نے ہاتھ دیئے ہیں اور اس کے ارادے کے تابع بنا رکھے ہیں تاکہ اس کا جوہر اختیار نمودار ہو۔ لیکن وہ اس ہاتھ کو بے حس وحرکت کردے تو یہ جنبش تو کرے۔ اس نے پاؤں دیئے ہیں اور اس کے ارادے کے تابع بنا رکھا ہے کہ چاہے یہ ان پیروں سے صحیح راستے پر چلے، چاہے غلط راستے پر چلے۔ لیکن وہ اس پیر کو معطل کردے تو یہ ایک قدم چل کر تو دکھائے۔ عین اس وقت جب یہ کہہ رہا ہے کہ میں خدا کو نہیں مانتا، عین اسی وقت دل کی دھڑکن اطاعت کر رہی ہے، نبض کی جنبش اس کی اطاعت کر رہی ہے، خون کی روانی اس کی اطاعت کر رہی ہے۔ جتنی اطاعت اسے لینی ہے، وہ تو لے رہا ہے۔ ایک زبان اس کے قبضے میں ہے، زبان کے اس قبضہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے دیئے ہوئے اختیار کو اس کے خلاف استعمال کر کے انکار کر رہا ہے تو حقیقت میں اُس سے اسلام کا مطالبہ جو ہے، وہ صرف شرافت کا مطالبہ ہے کہ جس کی اطاعت جبری کرنی ہے، اس کی اطاعت اختیاری کرلو تو تمہارا جوہر انسانیت نمودار ہوگا ورنہ جو اطاعت اسے لینی ہے، وہ تو وہ لے ہی لے گا مگر وہ اطاعت ایسی ہوگی جیسے پتھروں کی اطاعت ہے، جیسے درختوں کی اطاعت ہے، جیسے حیوانوں کی اطاعت ہے۔ اگر انسانی اطاعت کرنا ہے تو اپنے ارادہ سے اطاعت کرلو۔ اس صورت میں اگر اطاعت کرو گے تو جزا کے مطالبہ کا تمہیں کوئی حق نہیں ہوگا اور ارادہ کے ساتھ اگر اطاعت کرو تو پھر جزا ہوگی۔ یہاں ایک بڑی حقیقت ہے کہ دنیا کی

حکومتوں میں مخالفت کی سزا ہے مگر موافقت کی جزا نہیں ہے۔ایک دفعہ قانون کی خلاف ورزی کرے تو پکڑا جائے لیکن اگر عمر بھر قانون کے مطابق عمل کرے تو کوئی صلہ نہیں ملے گا۔ کہا جائے گا کہ یہ تو رعایا ہونے کا لازمی تقاضا ہے اور وہ کہ جس کی ذاتی حکومت ہے، وہاں مخالفت کی سزا اور موافقت کی جزا ہے۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ قرآن و حدیث کے مطالعے کی بناء پر عرض کر رہا ہوں کہ اگر سزا کا اعلان ہے تو وہ ٹل بھی سکتا ہے مگر جزا کا اعلان ٹلنے والا نہیں ہے۔دوسرا فرق یہ ہے کہ سزا عمل سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ جتنا گناہ اتنی سزا۔جزا کے لئے کم از کم دس گنا کا اعلان کیا کہ ایک نیک کام کرو گے تو دس گنا اس کی جزا ملے گی۔

کسی نے مجھے مدعو کیا، میں نے سوچا کہ پتہ نہیں مجھے کیوں مدعو کیا ہے؟ وہ وقت مقررہ پر آئے اور مجھے لے گئے۔بعض لوگ بہت سے لوگوں کو مدعو کرتے ہیں تو جو بھی یاد آتا ہے، اُسے اپنے تعلقات کی وسعت کے مظاہرے کے لئے بلا لیتے ہیں۔آج کل جو احکام الٰہیہ پر عمل ہوتا ہے، اس میں بھی اپنے تعلقات کی نمائش ہوتی ہے، یہاں تک کہ افطارِ صوم کی دعوت ہے تو اس میں اکثر روزہ دار نہیں بلائے جائیں گے۔جو بڑے لوگ ان سے متعلق ہیں، یعنی ان کے شایانِ شان ہیں، جن سے تعلقات قائم کرنا ہیں، انہیں مدعو کیا جائے گا۔معلوم ہوا کہ انہیں روزے سے کوئی مطلب نہیں، اس کے معنی یہ کہ نام ہے افطارِ صوم کا اور مقصد اپنی دوستی اور تعلقات کا مظاہرہ کرنا ہے۔ایسے ہی اکثر نذر و نیاز وغیرہ کی جاتی ہے اور ان سے جو مقصد امدادِ غریباں کا ہے، وہ فوت ہوجاتا ہے۔غریب آئیں تو ان کے

کپڑوں کے میلے پن کو دیکھ کر رد کر دیا جاتا ہے اور جو ان کے حسب حیثیت ہیں، ان کو مدعو کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ نذر بارگاہِ معصومین میں قبول ہوگی یا نہیں اور خدا اسے قبول کرے گا یا نہیں کیونکہ اصل قبول کرنا تو اسی کو ہے۔ نذرانہ کے لئے ہوئی مگر قبول کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

پس انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، اس میں بہت زیادہ نمود و نمائش ہوتی ہے۔ جناب امیر علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں ایک گورنر کو بڑا سخت خط لکھا ہے کہ بصرہ میں ایک شخص نے تمہیں مدعو کیا، رؤسائے بصرہ میں سے ایک آدمی نے، اور تم وہاں بڑی تیزی سے گئے۔ یہ عتاب کا انداز ہے کہ بڑی تیزی سے، بڑے ذوق وشوق سے وہاں گئے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی کہ تم ایسے افراد کے ہاں دعوت میں جاؤ گے، جہاں دولت مندوں کو بلایا جاتا ہو اور محتاجوں کو واپس بھیج دیا جاتا ہو۔ امیر المومنین علیہ السلام نے جس بات پر تنبیہ فرمائی تھی، وہ بات ہمارے ہاں ہو رہی ہے، اکثر عبادات کے انجام دینے میں۔ اس سے جو دینی فوائد ہیں، وہ مفقود ہو جاتے ہیں اور لوگوں کی نظر میں مادّی فوائد کا حصول ہی ساری اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ پس جو جان رضائے الٰہی کے سوا کسی اور مقصد میں صرف ہو تو وہ جان ضائع اور برباد ہوگی۔ پس جان دینے میں بہت سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوگی۔ جس کو خالق نے یوں کہا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو۔ مشکل یہ پیش آئی کہ ہر چیز محتاج تھی۔ لہٰذا قربانی کا تصور تھا۔ لیکن انسان سے بالاتر جو ذات ہے، وہ کسی کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی خاطر کیونکر قربان ہوں۔ اس کے لئے کس طرح جان دیں؟ اس مشکل کو قرآن نے ایک لفظ سے حل کیا اور وہ یہ کہ مقصدِ قربانی کو ان الفاظ میں ادا کیا:

"اَلَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"۔ ''جو اللہ کی راہ میں قتل ہوں''

ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ راہ عین منزل نہیں ہوتی۔ منزل اور ہوتی ہے، راہ اور ہوتی ہے۔ ہاں! راہ پر چل کر منزل ملا کرتی ہے۔ راہ خدا کا مقصد یہ ہے کہ ان مقاصد کی خاطر جان دے جو اللہ کو پسند ہیں۔ ان مقاصد کی خاطر جان دینا فی سبیل اللہ جان دینا ہوا۔ مگر اللہ کی راہ کیونکر معلوم ہو؟ اگر منزل مادی ہو یعنی جسمانی تو اشارہ سے بتائی جا سکتی ہے، مثلاً کوئی پوچھے کہ ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟ تو اگر وہیں جا رہا ہے تو کہہ سکتا ہے کہ میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ اور اگر اُدھر نہیں جا رہا تو اشارے سے بتا سکتا ہے کہ اُدھر سے چلے جاؤ۔ لیکن یہاں جس کا راستہ ہے، وہ جسم و جسمانیت سے بری، آنکھوں سے دکھائی نہیں دے سکتا۔ کسی سمتِ خاص میں نہیں کہ اُدھر اشارہ کیا جائے، کسی مکان میں مقید نہیں کہ ادھر بتایا جائے۔ کوئی سمجھے کہ کعبہ ہے، اُدھر رُخ کر کے کہے کہ یہ ہے۔ تو ہر مسلمان جانتا ہے، جتنے لوگ خانۂ خدا سمجھتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہاں اللہ رہتا ہے۔ بود و باش کا تصور کسی کو نہیں ہے۔ حالانکہ بیت اللہ کہتے ہیں اور بیت اللہ صرف نام کو نہیں کہتے۔ دور دراز سے وہاں حج کو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ وہاں رہتا ہے۔ تو جسے بیت اللہ کہا، اس کے لئے تو نہیں کہتے کہ اللہ یہاں رہتا ہے اور جسے اُس نے عرش کہہ دیا، اس کے لئے کہتے ہیں کہ اللہ وہاں بیٹھتا ہے۔ ایک عقلی بات کہتا ہوں، ہر ایک فیصلہ کرے کہ جسے بیٹھنے کے لئے جگہ کی ضرورت ہوگی، اُسے رہنے کے لئے مکان کی بھی ضرورت ہوگی اور جسے رہنے کے لئے مکان کی ضرورت نہیں، اسے بیٹھنے کے

لئے جگہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی نسبت ہے اللہ کا گھر اور وہ بھی نسبت اللہ کا عرش۔ مگر جیسی نسبت ہوتی ہے، ویسا ہی اس کے ساتھ عمل بھی ہوتا ہے۔ یہ ہے اللہ کا گھر اور وہ ہے اللہ کا عرش۔ گھر کی نسبت کسی شخص کی طرف نجی اور ذاتی ہوتی ہے اور عرش کی نسبت تختِ سلطنت، یہ منصب کی ہوتی ہے۔ تو جسے گھر کہا تھا، جب نجی کام لینا ہوا، گھریلو، کسی کا زچہ خانہ بنانا تو اُسے منتخب کیا اور جب کسی کو سرکاری مہمان بنانا ہوا، وہاں بلالیا۔

کس طرح معلوم ہو اللہ کا راستہ؟ اشارہ کردیں تو کیا وہاں ہے؟ ادھر کہہ دیں تو کیا وہاں ہے؟ کون بتائے اللہ کا راستہ؟ اشارے سے بتایا نہیں جاسکتا۔ اب سادہ الفاظ میں ایک اصول بتاتا ہوں کہ جادہ شناس وہی ہوگا جو منزل شناس ہو۔ جو منزل کو جانتا ہوگا، وہی راستہ کو بھی جانتا ہوگا۔ اللہ کی راہ کو وہ جانے جو اللہ کی پوری معرفت رکھتا ہو۔ جب اللہ کی معرفتِ کامل رکھنے والا، جسے اُس نے رہنما بنایا ہے، وہ معرفت نہ رکھتا ہوتا تو رہنما کیوں بنایا جاتا؟ ہاں! ہم رہنما بناتے تو شاید وہ منزل سے واقف نہ ہوتا۔ جو اللہ کے بنائے ہوئے رہنما ہوتے ہیں وہ معرفتِ کامل رکھتے ہیں۔ وہی اس کی راہ کو بتاسکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہ جعفریہ میں یہ اصول ہوگیا کہ بغیر اذنِ امام کے جہاد نہیں ہوتا۔ اب اگر امام سامنے ہیں، رسائی ہے ان تک، تو خاص انہی سے پوچھا جائے گا۔ پھر جتنے عالم ہیں جن کی امام تک رسائی ہے، جس طرح آپ عالم سے مسئلہ پوچھنے کے محتاج، اسی طرح عالم امام سے مسئلہ پوچھنے کے محتاج۔ لیکن غیبت کے زمانہ میں، اوصاف کے لحاظ سے جنہیں انہوں نے

حقوق دیے ہوں، جن کے بارے میں کہا ہو کہ جب تک ہم تک رسائی نہ ہو تو یہ اوصاف جن میں پائے جائیں، وہ ہماری طرف سے ہمارے نائب ہیں۔

اس لئے جب وہ حضرات سامنے تھے، پیغمبر خداؐ اپنے دور میں اور ان کے بتائے ہوئے نامزد جانشین ہمارے آئمہ معصومینؑ جب تک رہے، جب تک ان کے حکم سے جہاد نہ ہو، وہ جہاد نہیں ہوگا، جنگ نہیں ہوگی۔ وہ جنگ چاہے کسی مفادِ اسلامی کے لئے ہو، جہاد اُسی وقت ہوگا جب ان کا اذن ثابت ہو۔ اس لئے بڑے بڑے صاحبِ اوصاف افراد نے بنی امیہ سے ٹکر لی اور شہید ہوئے۔

تو شہید اس معنی میں تو ہیں کہ مقتولِ مظلوم ہیں لیکن وہ شہادت جو اصطلاحی شہادت ہے، جس میں غسل وکفن نہیں ہوتا، وہ صرف اسی وقت ہوگی جب میدانِ جنگ میں امام کی اجازت سے ہو۔ معصومؑ کی اجازت سے ہو۔ اسی لئے ان لڑائیوں کو، جو چاہے مظلوم حیثیت سے لڑی گئی ہوں، بنی امیہ کے مقابلے میں، لیکن چونکہ ثابت نہیں ہے کہ ہمارے آئمہ کی تائید اس میں شامل ہے، اس لئے ہم نے ان لڑائیوں کو وہ درجہ نہیں دیا جو اُن لڑائیوں کو دیا ہے جن میں معصومینؑ شریک تھے۔ اسلام آباد میں ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ بنی ہاشم میں سے جن حضرات نے بنی امیہ سے ٹکر لی اور شہید ہوئے ان کا محرم میں تذکرہ کیوں نہیں کیا جاتا۔ وہ تو بنی اُمیہ سے جنگ ہے تو اگر ہمیں بنی امیہ سے مقابلے میں دلچسپی ہوتی۔ اسی لئے دنیا سمجھ لے کہ ہمارے ہاں کوئی جذباتی محبت اور نفرت نہیں ہے۔ ہم تو ان معیاروں کو دیکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ یہ درحقیقت معیار ہے تہذیب

جہاد ہو گئی یعنی چاہے امام کی زیر سربراہی میدان میں آئے ہوں۔ جو جارہا ہے وہ اجازت لے کر جارہا ہے اور اسے سخت سے سخت حالات میں نبھایا گیا۔ کربلا سے بڑھ کر کوئی ہنگامی وقت ہوسکتا ہے؟ لیکن کربلا کے میدان میں دیکھ لیجئے کہ جو شہید جاتا ہے امام سے اذن لے کر۔ امام سے اجازت لے کر جاتا ہے اور جب تک اجازت نہ ملے چاہے دل پر جو کچھ گزر رہی ہو لیکن اس وقت تک قدم آگے نہیں بڑھاتا جب تک اجازت نہ لے۔ جنگ مغلوبہ میں ادھر سے حملہ ہوا ہے۔ ادھر سے مولانے تو کبھی اپنی پوری جماعت کو حملے کا حکم نہیں دیا۔ یہ کارنامہ کربلا کی عجیب ندرت ہے کہ مولانے اپنے بہتر کو کبھی حکم نہیں دیا کہ حملہ کرو۔ جب جنگ مغلوبہ ہوئی تو اُدھر سے حملہ ہوا ہے اس میں جتنے شہید ہوگئے شہید ہوگئے۔ لیکن جتنے گئے ہیں میدان میں۔ چاہے احباب ہوں چاہے اعزہ۔ سب امام سے اجازت لے کر گئے ہیں اور جب تک اجازت نہیں ملی چاہے دل پر کیسی ہی بن رہی ہو۔ اس میں سب سے نمایاں ابوالفضل العباس۔ کہ بے تاب ہیں کب سے جہاد کے لئے مگر روز عاشور حکمت امام کہ علمدار بنادیا۔ علمداری مل گئی تو اسی وقت سمجھ لیا کہ میرے پیروں میں زنجیر پڑ گئی۔ اصحاب شہید ہورہے ہیں اور یہ زبان سے کہتے بھی نہیں کہ مجھے اجازت دیجئے کیونکہ اگر اجازت دینی ہوتی تو علم کیوں دیتے محل شناس تھے مگر ان کے دل سے پوچھے کہ مسلم ابن عوسجہ جیسا بوڑھا شہید ہوجائے اور عباس علم لئے کھڑے رہیں۔ امام کا بچپن کا دوست حبیب ابن مظاہر جن کی شہادت سے امام کے چہرہ پر شکستگی کے آثار نمودار ہوگئے اس کی لاش آجائے اور یہ علم سنبھالے کھڑے رہیں۔ ان کے دل پر کتنا سخت ہوگا مگر حکم امام۔ اور حکم امام

نہیں بلکہ نظام جہاد امام کہ علم ہاتھ میں لئے ہیں کیونکر جائیں مگر جب دل کے ٹکڑوں کی باری آئی تو ہر دفعہ جاتے ہیں کہ مولا اب مجھے اجازت دیجئے مگر ہر دفعہ مولا کہتے کہ تم تو علمدار ہو تمہیں کیونکر اجازت دوں عباس کے دل میں دل ڈال کر دیکھئے کہ فرزندان عقیل و مسلم کی لاشیں آجائیں اور اتنا ہی نہیں عون ومحمد کے لاشے آجائیں عباس کھڑے ہیں برداشت کر رہے ہیں لیکن جب قاسم کی لاش آئی تو اب ایک عجیب جملہ ہے جیسے ایک سپاہی اپنے سردار کے سامنے ہتھیار کھول کر ڈال دے مجھے یہی انداز نظر آرہا ہے عباس عرض کرتے ہیں کہ مولا عزیزوں کے صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اب تو عباس کا دل تنگی کرنے لگا اب تاب نہیں ہے۔ میں بارگاہ ابوالفضل العباس میں عرض کروں کہ اے میرے چھوٹے آقا مولا ابوالفضل العباس بے شک بڑا تحمل کیا بڑا صبر کیا بے شک بڑی برداشت سے کام لیا مگر مولا آپ عباس ہیں۔ یہ حسین ہیں آپ بھی چلے جایئے یہ آپ کا داغ بھی اٹھالیں گے۔ مولا نے ایک دفعہ وہی جملہ اور کہا اے عباس تم تو علمدار ہو۔ لیکن اب عباس خاموش نہیں ہوئے ہر دفعہ سر جھکا دیتے تھے مگر اب کہا مولا وہ فوج کہاں ہے جس کا میں علمدار ہوں۔ اس جملے نے بتایا کہ دل پر کیا گزر گئی صبح سے اب تک۔ مگر آئین جہاد نبھایا جا رہا ہے عباس جیسا شیر اس اُصول کی پابندی کر رہا ہے۔ تو جو جاتا تھا وہ اجازت لے اور ہر ایک کو مولا اجازت دیتے تھے۔ ان کو جانے کی اجازت دے دی کہ جاتے ہو تو ذرا پانی کی بھی فکر کرو۔ یعنی جانے کی اجازت ہو گئی اور علی اکبر نے جب اجازت مانگی تو میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اجازت تو دینی تھی، کیونکہ اگر انہیں اجازت نہ دیتے تو کیسے دیتے اب رہا کون ہے تو بھیجنا تو ہے

۔اب یہ کہتے ہیں بابا ہمیں اجازت دیجیے تو علی اکبر سے مخاطب ہو کر نہیں کہا جاتا کہ جاؤ اجازت ہے۔وہ کہتے ہیں اجازت اور یہ ہاتھ اٹھا دیتے ہیں بارگاہ خداوندی میں پروردگار وہ جا رہا ہے جو صورت وسیرت اور رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے تو معلوم ہوا کہ آخر تک یہ اصول قائم کیا گیا کہ جب تک اجازت نہ لے لیں اس وقت تک میدان میں نہیں جائیں گے۔ارباب عزا علی اکبر کے بعد کون بچا ہے جو اجازت لے کر میدان میں جائے۔جو مجاہد بچا ہے وہ بے زبان ہے میں کہتا ہوں وہ روایت آپ سنا کرتے ہیں کہ جھولے سے اپنے کو گرا دیا میں کہتا ہوں یہ جھولے سے خود کو گرانا نہیں تھا یہ طلب اجازت تھی ۔ایک دور جہاد ختم ہوا دوسرا دور جہاد شروع ہو رہا ہے۔جب خیموں میں آگ لگی ہوئی ہے اس جہاد کی جو ہستیاں سربراہ ہیں ان میں سے ایک ابھی تک غش میں ہے۔ایک خاتون معظمہ یقیناً اپنے وقت کی قافلہ سالار ہیں جن کے ہاتھ میں حسین کے جہاد کی باگ ہے وہ غش میں ہیں۔پہلے تو دیکھیے پردہ کی اہمیت کہ گھبراہٹ میں قدم نہیں اٹھتے۔پردہ کی راہ میں جہاد ہو رہا ہے۔وہ کیونکر۔ایک خیمے میں آگ لگتی ہے بی بیاں دوسرے خیمے میں چلی جاتی ہیں دوسرے خیمے میں آگ لگتی ہے تیسرے خیمے میں چلی جاتی ہیں۔جب سب طرف آگ کے شعلے بلند ہوئے تو اب بھی پریشان ہو کر قدم باہر نہیں اُٹھے سب سمٹ کر آئیں ثانی زہرا کے پاس کہ بزرگ خاندان ہونا بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔کہتی ہیں بی بی آپ بتایئے کہ جل کر مر جائیں یا قدم باہر نکالیں۔مجھے یقین ہے کہ جو مسئلہ مجھ جیسے جاہل کو معلوم ہے بھلا ممکن ہے کہ ثانی زہرا کو معلوم نہ ہو مگر کہتی ہیں بی بیوں خدا امام وقت

کو زندہ رکھے جب تک امام وقت سے نہ پوچھ لوں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔اب آئیں وہاں جہاں ہمارا آپ کا چوتھا امام غش میں پڑا ہے کہتی ہیں بیٹا اُٹھو آنکھیں کھولو اب تم امام وقت ہو۔یعنی باپ دنیا سے سدھارے اور امامت کا منصب تمہیں مل گیا ارے بیٹا آگ کے شعلے بلند ہیں تم بتاؤ جل کر مر جائیں یا قدم خیمے سے باہر نکالیں۔ظاہر میں تو مسئلہ پوچھنے آئی ہیں مگر دل یہ کہتا ہے کہ مسئلے سے تو واقف تھیں مسئلہ پوچھنے نہیں آئی تھیں یہ اذن جہاد لینے آئی تھیں کہ اب ہمارے جہاد کا وقت ہے اب تم امام ہوتے ہوئے ہمیں اجازت دو کہ ہم اپنا جہاد شروع کریں۔

# فلسفۂ شہادت

# پانچویں تقریر

- کس شہید کو غسل و کفن کی ضرورت نہیں ہوتی؟
- ''کشتگان راہِ خدا کو مردہ مت سمجھو'' سرنام کلام کی آیت کا پس منظر۔
- جنگ احد اور حضرت علیؑ کا رسولِ خداؐ سے دفاع۔
- جزاءِ اخروی اعمالِ اختیاری پر منحصر ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ میں اختیاری بات ثابت قدمی ضروری ہے اور بس۔
- اسلام ناحق خون ریزی کا حامی نہیں ہے۔
- بدر کا احوال۔ احد کی کچھ اور تفصیل۔
- ''جو محبت آلِ محمدؐ میں دنیا سے گیا وہ شہید ہو گیا'' یعنی زندہ جاوید ہو گیا۔
- ایصال ثواب۔ رواج کے ماتحت عمل بدعت نہیں ہوتا۔
- نیت کی بنیاد پر عمل میں شریک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ (آل عمران 169/3)

''جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں''۔

میں نے عرض کیا تھا کہ شہید کے لئے غسل و کفن نہیں ہے۔ تو پوچھا گیا کہ جو نائب امام کے حکم سے جہاد شروع کیا جائے، کیا اس میں شہید ہونے والے کے لئے بھی غسل و کفن نہیں ہوگا؟ تو جواب یہ ہے کہ جب اس میں شرع کی تمام شرائط پوری ہو گئیں تو جہاد ہے اور اس میں شہید ہونے والے کے لئے غسل و کفن نہیں ہے۔ فقہی احکام اسی شہید کے ساتھ مخصوص ہیں جو اس قسم کے جہاد کے معرکہ جنگ میں شہید ہو۔ لیکن اگر کوئی ظالم خواہ خدمت دین کی بناء پر کسی کو قتل کر دے تو وہ مقتول ظلم کے معنی میں شہید ہے لیکن فقہ کے احکام اس آیت میں جو اعلان حیاتِ جاودانی کے لئے کیا گیا ہے، وہ اس شہید کے ساتھ وابستہ ہیں جس پر فقہ کے اصول مرتب ہوں۔ اس حیاتِ جاودانی کا معیار "قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ" ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو۔

فرض کیجئے کسی شخص کو نصرت دین کی وجہ سے کسی نے نشانہ ظلم بنا دیا۔ اگرچہ معرکہ جنگ میں شہید نہیں ہے لیکن قتل ہونا راہِ خدا میں یقینی ہے، لہٰذا قرآن مجید کا اعلان اس کے لئے بھی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے راہ خدا میں جدوجہد اتنی کی کہ جس کی بناء پر اس کے قویٰ متحمل نہ ہو سکے اور وہ زیادہ

زندہ نہ رہ سکا تو وہ قتل تو نہیں ہوا ہے لیکن موت اس کی راہ خدا میں ہے۔ یہ حیاتِ جاودانی کی جو آیات ہیں، ان میں "اِنَّمَا" کے معنی ہوتے ہیں ایک شے کا ثبوت اور اس کے غیر کی نفی۔

"اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ الخ" (المائدۃ 55/5)

اس "اِنَّمَا" کے معنی یہ ہے کہ بس یہی ولی ہیں اور دوسرا کوئی ولی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کو ولی ماننا غلط ہے۔ ایک بہت بڑے ادیب تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کیا بات ہے کہ آپ کے ہاں اولیاء نہیں ہوتے؟ یعنی ہمارے گروہ میں اولیاء نہیں ہوتے۔ یہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا کہ اولیاء ہمارے ہاں کوئی الگ قوم نہیں ہے۔ جو ایمان و عمل کے جتنے درجہ پر فائز ہے، اتنے درجہ اس کو ولایت الٰہی حاصل ہے اور یوں بحیثیت منصب ولی وہ ہے جسے وہ خود مقرر کرے۔

آیہ تطہیر میں کلمہ حصر ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ط (الاحزاب 33/33)

اسی طرح یہ آیت جو میں نے سرنامہ کلام بنائی، چوتھے پارے میں ہے۔ اس میں "اِنَّمَا" کلمہ حصر نہیں ہے۔ اس آیت کا پس منظر کچھ یوں ہے، مختصراً عرض کرنا ہے۔ معرکہ احد کا نتیجہ کچھ یوں ہوا کہ کثرت سے لوگ شہید ہوئے اور جنہیں جان زیادہ عزیز تھی، انہوں نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ جان بچ جائے۔ بہت محتاط الفاظ میں بیان کروں تو بھی حقیقت تو سامنے

آئے گی۔ قرآن مجید کی آیات ہیں، کوئی روایت تو نہیں ہے۔ ناموں کا سوال نہیں، قرآن مجید میں نام نہیں ہیں اور میں بھی نام کب لے رہا ہوں، اور جو ایک اجتماعی عمل ہو، اس میں نام کہاں کہاں تک لئے جائیں۔

جنگ ختم ہوگئی، بہت سے لوگ شہید ہوگئے۔ جو لوگ میدان سے ہٹے ہیں، ان کی آپس میں گفتگوئیں ہیں۔ یہ گفتگوئیں اس میدان کے ہٹنے کے عمل سے زیادہ خطرناک ہیں، دینی حیثیت سے، یعنی میدانِ جنگ سے جان بچانے کے لئے ہٹنے کو تو ایک بشری کمزوری کہا جاسکتا ہے لیکن اس گفتگو سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلوں میں ایمان ہے ہی نہیں۔ اس کو اس عمل سے چسپاں کیجئے تو اس عمل کا پس منظران لوگوں کی آپس کی گفتگو سے معلوم ہوجاتا ہے جسے حضرت علی علیہ السلام نے ایک جملے سے تجزیہ کرکے بروقت بتادیا تھا۔ وہ جملہ وہ ہے جسے شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے، جو بیہقی ہند کہلاتے ہیں، مدارج النبوۃ میں تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ہندوستان میں منشی نول کشور نے چھاپی ہے جو ایک غیر جانبدار مطبع ہے۔ شاہ عبدالحق نے اس موقع پر لکھا ہے کہ میدانِ جنگ میں صرف ایک ذات رہ گئی تھی، حضرت علی علیہ السلام کی، آپ پیغمبر خدا کو تلاش کرتے ہوئے ایک گڑھے کے قریب پہنچے تو انہیں اس گڑھے میں زخمی حالت میں دیکھا۔ نفسیاتی طور پر چند جملے ہیں کہ اگر ان کا پس منظر سامنے نہ ہو تو وہ سمجھ میں نہیں آئیں گے کہ کیوں ارشاد فرمائے۔

میں کہتا ہوں کہ جماعت کے کردار پر پیغمبرؐ کا غیظ و غضب اتنا تھا کہ اب علی جو سامنے نظر آئے تو فرماتے ہیں: ''تم بھی کیوں نہیں چلے گئے؟'' ہر شخص اس جملے کی روح کو دیکھ سکتا ہے۔ دل کی کس کیفیت کا مظہر ہے کہ ''تم بھی کیوں

نہیں چلے گئے؟" بس علی جیسا مزاج شناس رسولؐ ہونا چاہئے کہ ایک جملے سے پیغمبر خداؐ کی کیفیت مزاج کو بدلا۔ علیؑ نے جواب دیا:

**"اَکُفر بَعدَ الاِیْمَان"**

"کیا ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتا"

میں کہتا ہوں کہ علی علیہ السلام کا یہ کہنا اور پیغمبر خداؐ کا تائیدی سکوت فرمانا بلکہ خوش ہو جانا، اس نے آج کرّ ار وفرار کو معیار کفر و ایمان بنا دیا۔ اس سے قبل کی لوگوں کی جو آپس کی گفتگو ہے، قرآن میں درج ہے۔ کسی راوی کی بیان کردہ نہیں ہے۔ وہ عجیب وغریب ہے۔ طولانی گفتگو ہے۔ غور سے دیکھئے، میں خلاصہ سنا رہا ہوں۔

جن حضرات نے، جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ دو چار افراد نہیں ہیں کہ آپ کا ذہن خاص افراد کی طرف جائے، وہ کثرت جو میدان سے ہٹی تھی، بجائے اس کے کہ اپنے عمل پر شرمندہ ہو اور جو شہدائے احد ہیں، ان کی تعریفیں کریں، وہ آپس میں گویا نازش کر رہے تھے کہ دیکھو! اگر یہ لوگ بھی ہماری طرح کرتے تو "مَا قُتِلُوْا"، پھر قتل نہ ہوتے۔ یعنی (معاذ اللہ) یہ سب احمق تھے جنہوں نے جانیں دے دیں۔ ہماری طرح عقل سے کام لیتے اور دنیا نے تو عقل کا معیار یہی رکھا ہے۔ اگر ہماری طرح عقل سے کام لیتے تو "مَا قُتِلُوْا"، پھر قتل نہ ہوتے۔ پیغمبر خداؐ ہم سے کبھی رائے نہیں لیتے تھے۔ آج کل دنیا کہتی ہے کہ رسولؐ ہر بات رائے سے کرتے تھے اور قرآن ان کی زبانی شکایت یہی کر رہا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم سے تو رائے لی ہی نہیں جاتی۔ ہم سے تو کوئی مشورہ لیتا ہی نہیں۔ اگر ہم سے مشورہ لیا جائے تو ایسے روز ہائے بد

کیوں دیکھنا پڑیں۔ آخر ہمیں بھی ان معاملات میں کوئی دخل ہے یا نہیں؟ آخر ہم جمہور ہیں تو ہمارا دخل ہونا چاہیے ان باتوں میں۔

"لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا" (آل عمران 154/3)

"اگر ہمیں کوئی اس امر میں دخل ہوتا تو ہم کیوں قتل ہوتے؟"

اب ان قتل ہونے والوں میں اپنے کو شامل کرلیا۔ وہ کبھی ان میں شامل نہیں ہوتے، یہ ان میں شامل ہو گئے۔ "مَا قُتِلْنَا"، تو اس طرح سے ہم قتل نہ ہوتے۔ یہ ہے پس منظر جس میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ تم ہٹنے کے بعد کیا موت سے بچے رہو گے؟ اس سے قبل کی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ جب ہم جانیں جب تم اپنے گھروں میں رہ کر موت سے بچ جاؤ۔ کیا اگر تم گھروں کے اندر رہے تو تمہیں موت نہیں آئے گی؟ جب ہم جانیں کہ تم بچ جاؤ اور رہ گئے یہ کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو۔

"بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ"

"بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں"

تو اصل میں یہ لوگ جو تصور کر رہے تھے کہ شہداء نے بیکار جانیں دیں، ان کی جانیں فضول گئیں، اس کے مقابلہ میں قرآن مجید میں شہداء کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے علاوہ جو عمر صرف کرے، راہ خدا میں، وہ زندۂ جاوید نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کو جو راہ خدا سے جان بچائیں، اس خیال سے کہ اس طرح ہماری زندگی بچ گئی، ان کے مقابلہ میں کہا جا رہا ہے کہ تمہاری زندگیاں بچی ہوئی نہیں ہیں۔ تم تو جب مرنا ہو گے، مرو گے اور مرو گے تو ہلاکت ہی ہو گی۔ ہاں! یہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں،

انہیں مردہ نہ سمجھو۔ چونکہ اصل گفتگو انہی میں تھی، ان کے لئے تصور یہ تھا کہ بیکار مر گئے۔ اس لئے کہا گیا کہ ان کو مرا ہوا نہ سمجھو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو میدان جنگ میں اس طرح سے نہ جائے، وہ مردہ ہے۔ وہ تو جب کوئی دلیل حصر ہوتی، انحصار کا ثبوت ہوتا۔ یہاں نہ پس منظر ہے نہ انحصار۔

اب میں عقلی طور پر پہلے آپ کے سامنے اس سوال کو پیش کرتا ہوں، ماشاءاللہ صاحبان عقل وفہم ہیں، دو آدمی میدان جنگ میں آئے، دونوں نے بھرپور جنگ کی۔ ایک پر مقابل کا وار کام کر گیا، ایک پر دشمن کا وار کام نہیں کرسکا۔ یاد رکھئے کہ **جزائے اخروی اعمال اختیاری پر منحصر ہوتی** ہے۔ جب اختیاری کارنامہ عمل میں دونوں یکساں ہوں تو وار کا چلنا یا نہ چلنا اتفاق ہے۔ اللہ کے ہاں جزا اتفاق سے وابستہ نہیں ہوتی۔

اب جو عرض کر رہا ہوں، فرصت کے لمحات میں اس پر غور کیجئے گا، میدان جنگ میں آکر اختیاری بات تو **ثابت قدم** رہنا ہے۔ مسلمانوں میں دو معزز لقب ہیں غازی اور شہید۔ یعنی زندہ رہے تو غازی، مر گئے تو شہید۔ اپنے بس میں قائم رہنا ہے، برقرار رہنا ہے، ثابت قدم رہنا ہے۔ غازی ہونا بھی اپنے بس کا نہیں اور شہید ہونا بھی اپنے بس کا نہیں۔ ثابت قدم رہے، اگر ہمارا وار چل گیا دشمن کو ختم کر کے زندہ واپس آگئے تو غازی ہو گئے۔ اگر اس کا وار چل گیا اور ہم گر گئے زخمی ہو کر تو شہید ہو گئے۔ نہ غازی ہونا اپنے اختیار میں، نہ شہید ہونا اپنے اختیار میں۔ جمارہنا اپنے اختیار میں ہے۔

ایک بڑی حقیقت ہے جسے صاحبان فہم اپنی فہم کے اعتبار سے جانچ لیں عقلی طور پر صحیح ہے یا نہیں! وہ یہ عرض کررہا ہوں دینی حقیقت کہ اگر شہادت کے شوق میں میدان جنگ میں کوئی کمی ہوگئی دشمن کے مقابلے میں تو یاد رکھئے کہ شہادت کی منزل دور رہ جائے گی۔ یعنی میدان جنگ میں ہر مجاہد کو یہ طے کر کے آنا چاہئے کہ ہمیں قاتل ہونا ہے، حالانکہ لوگ خونریزی سے بہت گھبرانے لگے ہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ مسئلہ بہت زور وشور سے پیش کیا جارہا ہے کہ اسلام میں خونریزی جائز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام میں خونریزی نہ ہوتی تو جہاد کا حکم ہی نہ ہوتا۔ میں ایک مرتبہ الہ آباد گیا۔ یہ قضیے تازہ تھے۔ میری اطلاع کے بغیر موضوع کا اعلان کر دیا گیا۔ جب میں گیا تو معلوم یہ ہوا کہ اسلام میں خونریزی نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا پس منظر کیا ہے۔ اسلام خونریزی کا حامی نہیں ہے۔ اعلان ہوگیا۔

تو مجھے اس پر تقریر تو کرنا تھی۔ پہلے ایک اصولی بات کہی کہ ایک (debate) ہوتی ہے۔ اس قسم کا یک رخا موضوع ڈبیٹ کا ہوتا ہے کہ کوئی موافق تقریر کرے، کوئی مخالف تقریر کرے۔ اس کے بعد رائے شماری ہوتی ہے، ووٹ لئے جاتے ہیں۔ وہ ڈبیٹ کا موضوع ہوتا ہے۔ لیکن ایک مقرر کو جو موضوع دیا جائے، اسے جملہ ناتمام ہونا چاہئے۔ مثلاً اسلام اور خونریزی۔ اب یہ اس مقرر کا کام ہے کہ اسلام حامی ہے یا نہیں ہے۔ جب آپ نے خود ہی طے کر لیا کہ اسلام خونریزی کا حامی نہیں ہے تو پھر تقریر بھی خود ہی کر لی ہوتی۔ میری کیا ضرورت تھی؟ میں نے کہا کہ اگر اس میں ایک لفظ اور بڑھا دیا جائے تو پھر میں اس موضوع کی موافقت

میں تقریر کرنے کے لئے تیار ہوں اور وہ لفظ یہ ہے کہ "اسلام ناحق خونریزی کا حامی نہیں ہے"۔

اب میدان جنگ میں جو شخص آئے، اسے یہ طے کر کے آنا چاہئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دشمنوں کی جان لیں گے اور قتل کریں گے۔ پھر اتفاق سے اگر دشمن کا وار چل جائے اور قتل ہو جائیں تو شہید ہیں اور اگر دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر اس شوق میں کچھ رعایت کر دی کہ شہید ہو جائیں تو یاد رکھئے کہ یہ شوق شہادت باعث ہلاکت ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل معیار ثابت قدم رہنا ہے اور میدان جنگ میں کوتاہی نہ ہونا ہے۔ اب اگر کوتاہی نہ ہو جانے کے باوجود دشمن کی تلوار کام کر جائے تو پھر شہید ہو گا۔

اگر آپ غور کریں تو آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو بات اپنے بس کی نہ ہو، اس پر احکام شرع مرتب نہیں ہو سکتے، نہ خالق کی جزا ایسے امر سے متعلق ہو سکتی ہے جو اپنے اختیار سے وابستہ نہ ہو۔ اب میں آپ کے بالکل جانے پہچانے واقعات کو پیش کر کے آپ سے فیصلہ کروانا چاہتا ہوں کہ کیا ہر میدان میں جو شہید ہو جائے، اس کا رتبہ اونچا ہے اور جو شہید نہ ہو اس کا رتبہ نیچا ہے؟

سب سے پہلی لڑائی بدر ہے غزوات اسلامی میں۔ اس میں ادھر سے تین سورما آئے۔ عرب کے بڑے منجھے ہوئے بہادر۔ عتبہ، شیبہ اور ولید ادھر سے نکلے۔ تینوں کے تعارف کے لئے ایک ہی گھر کا حوالہ کافی ہے۔ وہ جو عتبہ ہے، وہ امیر شام کا نانا ہے۔ شیبہ عتبہ کا بھائی ہے اور ہمارے محاورات میں نانا کا بھائی بھی نانا اور ولید اسی عتبہ کا بیٹا ہے۔ جو نانا کا لڑکا ہے، وہ ماموں ہوتا ہے۔ ہو گیا تعارف!

ادھر سے تین انصاری آئے ۔وہ تو بیڑا اٹھا چکے تھے نصرت کا۔ انہوں نے اپنے عمل سے اس کو نبھایا کہ ادھر سے تین انصاری گئے، مدینہ کے باشندے ۔انہوں نے کہا تمہارا نام؟ انہوں نے کہا: معاذ، معوذ اور تیسرے نے نام بتایا۔انہوں نے کہا: ہم تم سے جنگ نہیں کرنا چاہتے ۔جاہلیت میں نسب کا غرور ہوتا تھا۔ کہنے لگے کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے۔تم ہمارے برابر والے نہیں ہو۔ پیغمبر اسلام سے کہو کہ ہمارے برابر والوں کو بھیجیں۔وہ واپس آگئے ۔یہاں سے جناب حمزہ، پیغمبر کے چچا، ایک عبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب ، تیسرے علی ابن ابی طالب علیہما السلام۔ رشتہ میں جناب حمزہ سب سے بڑے تھے۔یہ دونوں چچازاد بھائی تھے، وہ چچا تھے۔جناب عبیدہ عمر میں ان سب سے بڑے تھے ۔پیرانہ سالی کی عمر میں تھے۔ان سے چھوٹے حمزہ تھے، پیغمبر خدا کے ہم عمر تھے۔عمر میں سب سے چھوٹے حضرت علی علیہ السلام تھے جن کے بارے میں اس کے بعد بھی مدتوں کہا گیا کہ یہ تو بچے ہیں۔بچے کو بوڑھا بنانے کا مجھے شوق نہیں ہے۔ جو جس کی عمر ہے وہ تو ہے۔دنیا عمر کو پیدائش کے لحاظ سے گنتی ہے۔جب سے یہ خلق ہوئے ہیں، اس وقت سے عمر نہیں دیکھی جاتی، وہ تو اس پیدائش کے لحاظ سے دیکھتی ہے۔لہٰذا بے شک بچے ہیں مگر بچے کے معنی یہ ہیں کہ چوبیس پچیس برس کے۔ان لوگوں میں سب سے کم عمر ہیں۔

اس سے پہلے پیغمبر اسلامؐ کے مکہ کے دور میں جنگ کا سوال ہی نہیں تھا۔لہٰذا انہیں تلوار چلانے کا موقع کب ملا۔ مدینہ آکر پہلی جنگ ہے۔ تو جناب حمزہؓ تو آزمودہ کار سپاہی ہوں گے۔عبیدہؓ کی عمر حمزہؓ سے بھی زیادہ تھی

تو وہ عرب کی اور لڑائیوں میں شریک ہوئے ہوں گے۔لیکن حضرت علی علیہ السلام تو بالکل نمایاں بات ہے کہ پہلی دفعہ میدان جنگ میں گئے ہیں۔مگر ان دونوں کے ساتھ ساتھ رسولؐ نے انہیں بھیجا ہے۔یعنی رسول کے لئے ان کی صفات محتاج تجربہ نہیں ہیں۔

انہوں نے ان کا نسب پوچھا۔انہوں نے بتایا۔انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، برابر کی لڑائی ہے۔ایک ہی خاندان کے ہیں۔یہ بے شک ہمارے مد مقابل صحیح بھیجے ہیں۔ایک اصول ان کے ہاں تھا کہ مقابلے میں عمر کا تناسب بھی کرتے تھے۔لہٰذا عبیدہؓ کا مقابلہ ان میں سب سے سن رسیدہ پہلوان سے۔مگر وہ فنون جنگ میں بھی سب سے زیادہ ماہر تھا۔ان کا اس سے سخت مقابلہ ہوا۔ جناب حمزہؓ کا مقابلہ ہوا عتبہ سے اور جناب علی علیہ السلام کا اس سے مقابلہ ہوا جو امیر شام کا حقیقی ماموں تھا۔اسی پس منظر میں بعد کے سب واقعات ہیں۔ جناب حمزہؓ نے اپنے مقابل کو تہہ تیغ کیا۔حضرت علی علیہ السلام نے جو سب سے جوان تھا ولید، اس کو تہہ تیغ کیا۔جناب عبیدہؓ نے شیبہ کو زخمی کیا۔وار چونکہ کاری نہیں تھا، اس لئے زخمی ہونے کے بعد وہ نہیں گرا۔ اس نے جو وار کیا، اس سے جناب عبیدہؓ گر گئے۔اس طرح وہ بدر کے پہلے شہید ہو گئے۔علی ابن ابی طالب علیہما السلام اپنے حریف سے فارغ ہو چکے تھے۔آپ کی زبان میں کہوں کہ نمٹ چکے تھے۔لہٰذا وہی تلوار لے کر، جو کھینچی ہوئی تھی، اس حریف کی طرف چلے گئے جو زندہ کھڑا تھا۔اب اسے تہہ تیغ کیا۔اس کا مطلب ہے کہ پہلے ہی معرکہ میں حمزہؓ کا کردار اکہرا رہ گیا، ان کا کردار دوہرا ہو گیا۔

اب آپ سے سوال ہے، آپ کے ضمیر انسانی اور ضمیر ایمانی سے کہ نتیجہ آپ کے سامنے جو مسلمہ ہے، وہ میں نے پیش کر دیا۔ اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا عبیدہؓ کا مرتبہ اس لئے اونچا ہو گیا کہ وہ جنگ کو سر نہ کر سکے اور علیؑ کا کردار (معاذ اللہ) اس تصور میں گھٹ گیا کہ انہوں نے اپنے دونوں حریفوں کو تہ تیغ کر دیا اور صحیح سلامت واپس ہوئے فتح یاب ہو کر؟ کیا عدل الٰہی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ علیؑ کے کارنامہ کو پست کرے اور عبیدہ کے کارنامے کو بڑھائے؟ کسی کا ضمیر انسانی اس کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ تو کیا جو شہید ہو گیا، اس کا درجہ اونچا ہے؟ یا جو زندہ رہا، اس کا درجہ اونچا ہے؟

اب آیئے دوسری جنگ عظیم احد۔ کتنے شہید ہو گئے۔ میں نے ابھی کہا کہ کارواں ہے شہیدوں کا اس میں۔ صرف جناب حمزہؑ نہیں ہیں۔ وہ اتنے ہیں کہ ان کے نام بھی ہمیں نہیں معلوم۔ ناموں کا معلوم نہ ہونا دلیل کثرت ہوتا ہے۔ ان سے کم جو میدان سے ہٹے مگر پھر بھی اتنے ہیں کہ ایک جماعت ہے اور کافی اچھی بڑی ہے جو میدان جنگ میں شہید ہوئی۔ اب صفحۂ میدان کے سادہ ہونے کے بعد، دونوں طرح سادہ ہوا، جو بیچارے شہید ہو گئے، ان سے بھی خالی ہو گیا اور جنہوں نے نقل مکانی کر لی، ان سے بھی خالی ہو گیا۔ اب میدان جنگ سادہ ہے اور ایک فرد واحد ہے جس نے بگڑی ہوئی جنگ کو بنا دیا۔ جس نے بظاہر اس فتحیاب جماعت کو پھر ایسی مکمل شکست دی اور اتنی دور بھگا دیا کہ اطمینان کے ساتھ رسولؐ کے پاس آئے۔ ان سے باتیں کیں، گفتگو کی۔

میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے ، میں کہوں گا کہ معیار فہم انسانی پر غور کیجئے۔ معیار عقل ایمانی پر بھی غور کیجئے کہ کیا وہ سب شہدائے احد افضل ہیں اور علیؑ جو جنگ کو سر کر کے واپس آئے (معاذ اللہ) ان کا اس لئے درجہ گھٹ گیا کہ اسلام کو فتحیاب کر کے واپس ہوئے؟ آپ کا عقل وضمیر کیا فیصلہ کرتا ہے؟ یقیناً ان کا کردار بلند تر ہے۔ تو مرتبہ عمل بھی بلند تر ہے اس کے لحاظ سے جزا بھی بلند تر ہے ۔اب آپ فیصلہ کیجئے یا نہ کیجئے ، میں کہتا ہوں کہ فرشتے کو میں کیا کہوں کہ اس نے شہید ہونے والوں کا کلمہ نہیں پڑھا، جو زندہ واپس آ گیا اس کا کلمہ پڑھا:

"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیُّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار". (الکافی: کتاب الروضہ۔ جلد ۸)

اس کے بعد پھر بڑی لڑائی ہے، جنگ خندق، جنگ احزاب۔ ادھر وہ ہزار کے مقابل والا ایک آ گیا جس طرح عبیدہؓ وہاں زخمی ہوئے تھے، بے شک یہ ایک سورما ایسا ہے کہ جس نے حضرت علی علیہ السلام کو زخمی کر دیا۔ یقیناً جو وہاں اس کا رعب جما رہے تھے کہ ہزار کے مقابلہ میں ایک ہے، اس سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو اس نے اپنے فنون جنگ کا مظاہرہ کر کے ثابت کر دیا۔ یعنی معلوم ہوتا ہے دنیائے کفر میں اس کا جواب نہیں تھا۔ ایک بات تو یہ کہ علی علیہ السلام کا کوئی بھی مقابل ایک وار کی آمد و رفت سے زیادہ نہیں ٹک سکا ہے۔ بس ایک وار۔ مگر یہ شخص حضرت علیؑ کے سامنے اتنا جما ہے کہ ستر ضربوں کے ردّ و بدل کی نوبت آئی ۔ارے اگر دنیائے کفر میں ممتاز نہ ہوتا تو رسول کل کفر کیوں کہتے؟ ستر ضربوں کے ردّ و بدل کی نوبت آئی اور تاریخ نے

مرقع کشی کی ہے کہ دونوں طرف کے بہادر۔ دونوں طرف کے سورما۔ ایک جیسے الفاظ استعمال ہوں۔ تو دونوں ادھر ادھر کے گرد کے حصار میں چھپ گئے تھے۔ بس تلوار کی چمک دکھائی دے رہی تھی اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام بہادر ہکا بکا بار پردہ دیکھ رہے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ ہی نہیں رہے تھے، دیکھتے دیکھتے کچھ دہل بھی رہے تھے کہ اب وہ کہیں یہاں تک نہ آ جائے اور کچھ یوں محبت میں بشری حیثیت سے، غرض یہ کہ سب کی نظریں لڑی ہوئی تھیں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی دلیل ہے کہ قوت امامت سے جنگ نہیں کی جاتی تھی، فنون جنگ سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔ انسانی طاقت سے لڑا جاتا تھا۔ طاقت امامت اور علم وہبی کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی مجال تھی کہ اتنی دیر تک رک سکے۔ ستر مرتبہ رد و بدل کی نوبت آئی اور ستر مرتبہ کے بعد اس نے تلوار ماری تو سر مبارک تک پہنچ گئی۔ امیر المومنینؑ کے وار ہمیں معلوم ہیں کہ ہمیشہ سر پر تلوار ماری ہے اور دو پارہ کر دیا ہے۔ مرحب کے سر پر تلوار ماری اور خود کو کاٹا، سینے تک پہنچی۔ حضور سر پر وار کرتے تھے، دو پارہ کرتے تھے۔ یہ ان کا خاص وار تھا مگر یہ بھی دلیل ہے اس کے امتیاز خاص کی، اپنے شعبے میں کہ علی کو وار بدلنا پڑا۔ یعنی جو اسے بھی معلوم تھا کہ خاص وار یہ ہے۔ وہ اس سے بچتا رہا اور اس وار کا اس نے موقع نہ دیا جوان کا خاص وار تھا۔

لہٰذا علی علیہ السلام نے سر کو دکھا کر کمر کو تلوار ماری۔ یہ وہ واحد شخص ہے جسے کمر پر تلوار مار کر زخمی کیا اور اس کے زخمی ہو کر گرنے کے بعد حضرت کو ضرورت ہوئی کہ اس کے سر کو قلم کریں۔ ابھی اس میں اتنی جان تھی کہ لعاب دہن اس نے روئے مبارک پر پھینکا۔ یہ اس کی بہادری کی دلیل ہے کہ اتنی

جنگ کرنے کے بعد اور ہلاکت کے قریب ہو جانے کے بعد خوف سے منہ خشک ہو جاتا ہے مگر لعاب دہن کا باقی ہونا اس کی انتہائی بے جگری کی دلیل ہے کہ اس نے لعاب دہن چہرۂ مبارک پر پھینکا۔ حضرت اتر گئے اور پھر اس کا سر قلم کیا تا کہ اس کا قتل کرنا بالکل اللہ کی راہ میں ہو۔

اب واپس ہوئے تو زندہ واپس ہوئے ہیں۔ اسے قتل کر کے واپس ہوئے ہیں۔ زخمی سہی مگر یہ کہ صحیح سلامت واپس ہوئے ہیں۔ تو کیا اس لئے یہ کارنامہ غیر وقیع ہو گیا کہ یہ شہید نہیں ہوئے، زندہ واپس ہوئے ہیں؟ معاذ اللہ، اس لئے کارنامہ ہلکا ہو گیا کیا؟ کیا آپ کا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ اور میں کیا کروں کہ رسول اس ضربت کی تعریف کر رہے ہیں جس میں علیؑ نے جان لے لی ہے، ان کی جان گئی نہیں ہے۔

"ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْن"

(مشارق انوار الیقین)

"علی کی یہ ضربت جو روز خندق ہے، ثقلین کی عبادت سے قیامت تک کے لئے افضل ہے"۔

میں پوچھتا ہوں کہ شہیدوں کی عبادت، عبادت ثقلین میں شامل ہے یا نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ ثابت قدم رہنا معیار ہے، شہید ہو جانا معیار نہیں ہے۔ اگر کسی نے خطروں کا منتظر رہتے ہوئے زندگی گزاری، ہر وقت تیار رہا ہے کہ جان راہِ خدا میں جائے لیکن کوئی قاتل نہیں آیا تو کیا ظالم کے عمل سے اس کی بلندی عمل وابستہ ہے کہ قاتل آتا تو اس کا درجہ اونچا ہو جاتا اور چونکہ قاتل نہیں آیا، اس لئے اس کا درجہ نیچا ہو گیا؟

اب سمجھ میں آجاتے ہیں پیغمبر خداؐ کے ارشاد کے معنی جو علامہ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں، جو حدیث ڈیڑھ صفحے میں درج فرمائی ہے اور وہ بھی آیۂ مودۃ کے تحت "قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"، (الشوریٰ 23/42) جو حدیث تفسیر میں درج کی ہے، اس کا جملہ ایک سلسلہ ہے:

"مَنْ مَاتَ عَلٰى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ"

"جو آلِ رسول کی محبت میں دنیا سے گیا"

"مَنْ مَاتَ كَامِلَ الْاِيْمَانِ"

اسلوب شاعری میں یہ ہوتا ہے کہ آدھا مصرعہ ہر شعر میں آتا ہے اور آدھا مصرعہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک صفحے کے قریب سلسلہ کلام یوں ہے "من مات علی حب آل محمد"، اس کے ساتھ کا جزو بدلتا رہتا ہے:

"مَنْ مَاتَ عَلٰى حب آل مُحَمَّدٍ مَاتَ كَامِلَ الْاِيْمَانِ".

"جو آلِ محمد کی محبت میں مرا، کامل الایمان مرا"

"مَنْ مَاتَ عَلٰى حب آل مُحَمَّدٍ مَاتَ مَغْفُوْرًا".

"جو آلِ محمد کی محبت دنیا سے گیا، وہ بخشا ہوا گیا"

"مَنْ مَاتَ عَلٰى حب آل مُحَمَّدٍ كُتِبَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ .."

"جو آلِ محمد کی محبت دنیا سے گیا، اس کی پیشانی پر آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ہوگا کہ یہ رحمت خدا کا حقدار ہے"

اس طرح کے فقروں کا صفحہ ہے اور پھر یوں صفحہ ہے:

"مَنْ مَاتَ عَلٰی بغضِ آلِ مُحَمَّدٍ"

ارے ایک جماعت کے مذاق کے مطابق کہتا ہوں، یہ علامہ رازی کو کیا ہوگیا تھا؟ رسول کو کیا کہوں مگر نقل کرنا تو ان کا کام تھا۔ ایک رخ کہہ دیتے، دوسرا رخ کیوں کہہ رہے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ بس توّلا تک ٹھیک ہے۔

میں کیا کروں امام فخر الدین رازی نے پیغمبر خدا کی حدیث نقل کی ہے۔ جتنے فقرے پہلے اسلوب کے تھے، اتنے ہی فقرے بعد کے اسلوب کے ہیں۔

"مَنْ مَاتَ عَلٰی بغضِ آلِ مُحَمَّدٍ"

"جو آلِ محمد کے بغض میں دنیا سے گیا"۔

جو بھی ہو، وہ:

"مَاتَ آیِس مِنْ رَحمَةِ اللّٰهِ"

"رحمت خدا سے مایوس کر گیا"۔

ہر فقرہ کے مقابل میں فقرہ ہے۔ پہلے سلسلے کا ایک فقرہ عرض کرتا ہے۔

"مَنْ مَاتَ عَلٰی حبِ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَہِیْدًا"

"جو محبت آلِ محمد میں دنیا سے گیا، وہ شہید ہے"۔

کیا پیغمبر خدا یہ کسی تاریخی واقعیت کا اظہار فرما رہے ہیں کہ جو محبت آلِ محمدؐ رکھتا ہے، وہ ضرور کسی نہ کسی معرکہ جنگ میں گیا ہوگا یا جائے گا؟ پیش گوئی ہے اور ضرور وہ دشمن کے حربے کا شکار ہوگا، شہید ہوگا۔ کیا رسول یہ اطلاع تاریخی دے رہے ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو کیا مطلب ہے کہ جو محبت آلِ محمدؐ میں دنیا سے گیا، وہ شہید ہوگیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز ہوتی ہے کنایہ۔ ''نکلا ڈکارتا ہو اضیغم کچھار سے''۔ کیا واقعی اس چیز سے دلچسپی ہے کہ انہیں شیر کہا جائے؟ یادرکھئے کہ شیر حیوانات میں داخل ہے۔ایک عام انسان اس سے بالاتر ہے۔تو کسی خاص انسان کو شیر کہنا اسے درجہ سے گرانا ہے۔تو شیر کہنے سے حیوان کہنا منظور نہیں ہے۔ جو اس کے لوازم میں سے ہے ذہن انسانی میں، شجاعت، اس شجاعت کو پیش کرنا ہے۔لازم سے ملزوم کی طرف اس کو ذہن میں لانا منظور ہے۔ویسے ہی رسولؐ نے فرمایا کہ جو محبت آل رسولؐ میں دنیا سے گیا، وہ شہید ہو گیا۔ تو قرآن میں دیکھو کہ شہید کا لازمہ کیا بتایا ہے؟ شہید کا لازمہ یہ بتایا گیا ہے زندگی جاوید کہ انہیں مردہ نہ سمجھو۔تو رسول فرمارہے ہیں کہ جو آل محمدؐ کی محبت میں دنیا سے جائیں ،انہیں مردہ نہ کہو، نہ مردہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔جو لوازم قرآن نے شہادت کے بیان کیے ہیں، رسولؐ فرمانا چاہتے ہیں کہ اس کے لئے معرکہ جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔اگر محبت آل محمد میں آخر رمق حیات تک گیا، قائم رہا، برقرار رہا، تو قاتل آیا ہو یا نہ آیا ہو، معرکہ جنگ میں گیا ہو نہ گیا ہو، اسماعیلؑ بھی ذبح نہیں ہوئے تھے مگر لقب ذبیح اللہ۔تو جس وقت میں محبت آل رسولؐ قتل ہونے کی ضمانت تھی، جو محبت آل رسول پر قائم رہا، وہ ہر وقت خنجر کے نیچے رہا یا نہیں؟

اب کوئی حجاج بن یوسف ثقفی پیدا نہیں ہوا تو اس کی وجہ سے کیا اس کے صلے میں کمی ہو جائے؟ جب یہ آخر دم تک خطروں کو محسوس کرتے ہوئے اسی راستہ پر رہا، جس کا نتیجہ ہمیشہ شمشیر و دار رہے، عنوان شمشیر و دار کے بدلتے

ہوں، محبت اہل بیتؑ کب پھولوں کی سیج رہی ہے؟ اگر کوئی اس سب کے باوجود اس راستے پر قائم رہا تو عدل الٰہی کے خلاف ہے کہ اس کو شہادت کا درجہ نہ دے۔

ایک طبقہ کی طرف سے کہا جاتا تھا کہ فاتحہ دلواتے ہو، اس میں غذا رکھتے ہو، تو کیا مرنے والا غذا کھائے گا؟ میں کہتا ہوں کہ اگر کھاتا نہیں ہے تو خدا نے کیوں کہا ہے کہ رزق حاصل کرتا ہے؟ جو کھاتا نہ ہو تو رزق کی کیا ضرورت ہے؟ اعتراض کے الفاظ بدلیں گے کہ کھاتا تو ہے مگر یہ کھانے نہیں کھاتا جو تم اس کے سامنے پیش کرتے ہو۔ اس کے لئے ایک جدید دنیا کی بات کرتا ہے۔ بہت آسان ہو گیا ہے میرا سمجھانا کہ آج کل کی دنیا کے جو معاشی قوانین ہیں، اس میں دو ملکوں کے درمیان انتقال زر ممنوع ہے۔ اکثر ملکوں میں ممنوع ہے۔ خاص طور پر وہاں جہاں افراط زر ہو۔ انتقال زر کا ایک قانونی ذریعہ مجھے معلوم ہے ورنہ غیر قانونی تو بہت سے لوگوں کو معلوم ہوگا۔ قانونی ذریعہ یہ ہے کہ بینک ہے جس کا رابطہ یہاں سے بھی ہے اور وہاں سے بھی ہے یا یہاں سے ہے اور وہاں کے کسی بینک سے ہے۔ آپ یہاں داخل کیجئے اور وہ وہاں کے بینک سے مل جائے گا جو ان کا حساب ہے، اس کے حساب سے۔

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے، یہاں تو آپ وہی کرنسی داخل کریں گے جو آپ کے پاس ہے مگر وہ بینک اگر وہی کرنسی وہاں بھیج دے تو وہاں بیکار ہوگی۔ لہٰذا امانت داری کے ساتھ، عقل سے کام لیتے ہوئے اور وہ عقل عمومی ہے وہ بینک اس کرنسی کو جو آپ نے داخل کی ہے، اس ملک کی کرنسی میں بدل کے اپنی امانت داری کے تقاضے سے پہنچا دے گا۔ اگر یہی کرنسی

پہنچادے تو امانت داری تو ہوگی مگر حماقت ہوگی۔ اگر نہ پہنچائے تو امانت داری نہیں ہوگی۔ اس کو امانت داری سے بھی کام لینا ہے اور عقل سے بھی کام لینا ہے۔ لہٰذا یہاں آپ سے آپ کی کرنسی لے گا اور وہاں اس کی کرنسی میں ادائیگی کرے گا۔ میں دنیا والوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا جتنی عقل آپ کے بینکوں کو ہے، (معاذ اللہ) اتنی عقل بھی اللہ کو نہیں ہے؟ ہم اپنے محبت کے جذبہ کے تحت اس کو تحفہ بھیجنا چاہتے ہیں مگر ہمارے پاس تو وہی کھانے ہیں جو ہمارے ہاں پکتے ہیں۔ ہم تو وہی دیں گے لیکن ہمارے ایمانی جذبہ کی قدر کرتے ہوئے، محبت کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے، اسے کسی کی محبت ناگوار نہیں ہے۔ ہماری محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کے کھانے اسے پیش کریں تو خدائے کریم کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ اس عالم کے کھانوں کی شکل میں منتقل کر کے ہمارے پیش کردہ ہدیے کو اس تک پہنچا دے۔

یہ سمجھ کر نہ کیجئے کہ شرع نے یہ طریقہ بتایا ہے ورنہ بدعت ہو جائے گی۔ شرک نہیں ہوگی، بدعت ہو جائے گی۔ کون ۲۲ رجب کو پوریاں پکاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ شرع میں آئی ہیں؟ کون عید کے دن سوئیاں کھاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ شرع میں آئی ہیں؟ بس عید کے دن سے سوئیاں مخصوص ہو گئیں اور ۲۲ رجب سے پوریاں مخصوص ہو گئیں۔ اس کو رواج کے ماتحت کیجئے تو بدعت نہیں ہوگا۔ حکم شرع سمجھ کر کیجئے تو بدعت ہوگا۔

تو بس یہ سمجھنا کہ زندگی جاوید اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم میدان جنگ میں جائیں، حالانکہ میدان جنگ میں جانا صدیوں نہیں ہو سکتا۔ وہ حالات کئی کئی سو برس نہیں پیدا ہوتے جن میں میدان جنگ میں جانا ہو۔ تو کیا

بیان جزاؤں سے محروم رہے؟ صرف اس وجہ سے کہ اس کے دور میں کوئی موقع ایسا نہیں آیا؟ موقع آنا نہ آنا تو اس کے بس میں نہیں تھا تو جو اس کے بس میں تھا، اس سے اس کا صلہ کیوں وابستہ ہو؟ میں اس کو آیہ قرآنی سے ثابت کر چکا اور حدیث سے ثابت کر چکا۔

امیر المومنین علیہ السلام ،جمل کا معرکہ ہے، فتح حاصل ہوئی، اصحاب جمع ہیں۔نہج البلاغہ میں ہے، اصحاب میں سے ایک شخص نے اپنے دوست کا نام لے کر کہا کہ کاش! وہ فلاں شخص بھی یہاں ہوتا اور جنگ میں شریک ہوتا اور اس فتح کو دیکھتا۔اس کے نہ ہونے پر افسوس کیا تو امیر المومنینؑ نے دریافت کیا: یہ بتاؤ کہ تمہارے اس بھائی کی محبت ہمارے ساتھ ہے؟ وہ ہمارے دوستوں میں سے ہے؟ اس نے کہا: بے شک وہ آپ کے دوستوں میں سے ہے۔تو ارشاد فرمایا: جب وہ ہمارے دوستوں میں سے ہے تو یقین جانو کہ وہ ہمارے ساتھ شریک ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے۔اس کا کیا ذکر، اس جنگ میں ہمارے ساتھ وہ بھی ہیں جو ابھی اپنے آباؤ اجداد کی پشت میں ہیں۔ جو ابھی شکم مادر میں ہیں۔وقت آئے گا کہ زمانہ انہیں سامنے لائے گا اور ان کے ذریعہ سے اس دور میں ایمان کو قوت کو ہوگی اور اس دور سے اللہ حق کی نصرت کرے گا۔تو جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں، صدیوں بعد میں، وہ بھی ہمارے ساتھ معرکہ میں شریک ہیں۔

اس لئے ہمیں سکھایا گیا ہے کہ جب واقعہ کربلا یاد کرو تو یہ کہو یا لیتنا کنا معکم یوم عاشورہ فنفوز فوزاً عظیمًا. کاش ہم آپ کے ساتھ ہوتے ۔ایک شخص سے معصوم نے کہا کہ اگر تم نے یہ صدقِ دل سے کہا

تو تمہارا شمار شہدائے کربلا میں ہو جائے گا یہ وہی اصول ہے جس کا اعلان علیؑ نے کیا۔ جو ایک فرد کہتا ہے اسی کو دوسری لفظوں میں دوسرا کہتا ہے دراصل سب ایک ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تم صدقِ دل سے کہہ رہے ہو یعنی جذبات تمہارے وہی ہیں تو پھر سمجھو کہ تم شہدائے کربلا میں شامل ہو۔ دنیا ہم سے کہتی ہے طرح طرح کے رُخوں سے اعتراض ہوتا ہے فلسفہ حدیث جہاں جہاں جو چیز سمجھ میں آتی ہے۔ جس طرح کربلا میں ایک وقت میں جو ہتھیار جس کے پاس تھا اس سے حملہ کرتا تھا جس کے پاس تیر تھا وہ تیر لگاتا تھا جس کے پاس نیزہ تھا وہ نیزہ لگاتا تھا اسی طرح ان کی عزا پر جو حربہ جس کی سمجھ میں آتا ہے وہ استعمال کرتا ہے۔ تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رونا بزدلی ہے رونا تو عورتوں کا کام ہے مردوں کا کام تھوڑی ہے کہ وہ روئیں۔ رونا تو بزدلی کی علامت ہے۔ میں اس کے جواب میں شرمندہ نہیں ہوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں گا ذرا سمجھ کر بات کرو کسی معرکہ میں محصور رہ کر رونا بزدلی ہے لیکن کسی معرکہ میں شریک نہ ہونے پر رونا عین شجاعت ہے۔ یہ بزدلی نہیں ہے۔ بخدا اگر ہم زیر رایت ابوالفضل عباس روز عاشورہ ہوتے تو کبھی نہ روتے۔ کربلا والوں میں کون رو رہا تھا حبیب ابن مظاہر روتے ہوئے اس دنیا سے گئے کیا مسلم ابن عوسجہ روتے ہوئے گئے کیا بریر ہمدانی روتے ہوئے دنیا سے گئے اور اہل عزا اب جب عزیزوں کی باری آئی تو کیا عون و محمد روتے ہوئے اس دنیا سے گئے قاسم اس وقت تک روئے جب تک اجازت نہیں ملی اور جب اجازت ملی تو روتے ہوئے دنیا سے تھوڑی گئے اور علی اکبر کیا روتے ہوئے اس دنیا سے گئے۔ مولا عزیزوں کے غم میں روئے جب میدانِ جہاد میں تھے تو تاریخ گواہ ہے۔

# التماسِ سورۂ فاتحہ

برائے بلندیٔ درجات

شہید استاد پروفیسر سبطِ جعفر زیدیؒ

شہید پروفیسر سید تقی ہادی نقویؒ

سید محمد علی جعفری ابن سید علی حیدر جعفری

تمام مرحومینِ ملت

اور

شہدائے راہِ حق

یہ کتاب **شہید** استاد پروفیسر سبطِ جعفر زیدیؒ
کی برسی کے موقع پر محمدؐ و آلِ محمدؐ کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کر رہے ہیں
پروردگارِ عالم محمدؐ و آلِ محمدؐ و شہدائے کربلاؑ کے صدقے میں یہ ہدیہ قبول فرما
اور اس کی بدولت ہمارے مرحومینِ کی مغفرت فرما اور انہیں اپنی رحمت کے
سائے میں جوارِ معصومینؑ میں جگہ عطا فرما اور سید العلماء آیت اللہ العظمیٰ
حضرت علامہ سید علی نقی نقویؒ (نقن صاحب) اعلی اللہ مقامہٗ
**شہید** استاد پروفیسر سبطِ جعفر زیدیؒ **شہید** پروفیسر سید تقی ہادی نقویؒ
اور **شہدائے راہِ حق** کے درجات میں بلندی فرما۔ آمین

## التماسِ سورۂ فاتحہ

برائے بلندیٔ درجات

**شہید** استاد پروفیسر سبطِ جعفر زیدیؒ

**شہید** پروفیسر سید تقی ہادی نقویؒ

تمام مرحومینِ ملت

اور

**شہدائے راہِ حق**




**(بین الاقوامی) ادارۂ ترویج سوزخوانی**
Founder: Ustaad Shaheed Prof. Sibt-i-Jaafar Zaidi
P. O. Box No. 10979, Karachi-74700 (Pakistan), Shaheed52013@gmail.com, www.itsbastah.com